چند روز اور
مکتبۂ اردو، لاہور

چند روز اور

خدیجہ مستور

مکتبۂ اردو۔ لاہور

چند روز اور

بانی

مکتبہ اردو

چوہدری برکت علی مرحوم

انتساب

پیاری امی کے نام !!

اہتمام : چوہدری محمد ذیشان
تعداد : پانچ سو
قیمت : -/۲۱ روپے

دیباچہ

"چند روز اور" خدیجہ مستور کے افسانوں کا تیسرا مجموعہ ہے آج سے کوئی چار برس پہلے ان کا دوسرا مجموعہ "بوچھار" کے نام سے شائع ہوا تھا۔ اور جب سے موجودہ اَدب کے طلباء کو اس سبک دست افسانہ نگار کے متعلق کافی تجسّس چلا آتا ہے۔ "چند روز اور" کی سب سے نمایاں خصوصیّت یہ ہے کہ وہ مصنفہ کے دوسرے مجموعے سے کئی بنیادی باتوں میں مختلف ہے۔ میں مختلف کہہ رہا ہوں، بہتر نہیں کہہ رہا۔ اس لئے کہ مجھے خدیجہ مستور کے پہلے افسانوں کی تحقیر مقصود نہیں۔ ہمارے ہاں آج کل عام طور سے یہ ہوتا ہے کہ نوجوان لکھنے والے اپنی اپنی ابتدائی تحریری زندگی میں ایک آدھ کتاب لکھ چکنے کے بعد عمر بھر اپنی ہی نقل اتارنے میں مصروف رہتے ہیں، چنانچہ ایک خاص عرصہ کے بعد ان کی تخلیقات میں نمو اور ارتقاء کا عمل دکھائی نہیں دیتا، لیکن "چند روز اور" اس بات کی شاہد ہے کہ

خدیجہ مستور نے ابھی تک اپنے پہ ذہنی اور فنی ارتقاء کے دروازے بند نہیں کئے نہ اپنی تحریروں کو تجربات اور مشاہدات کی کسی محدود نوع سے اتنا مخصوص کر لیا ہے کہ ان میں وسعت اور نیرنگی کی صلاحیتیں مفقود ہو جائیں۔

خدیجہ مستور کے ابتدائی افسانوں میں دو تین خوبیاں بہت زیادہ واضح ہیں۔ پہلی خوبی تو یہ ہے کہ انہیں سچ کہنے میں بہت کم دریغ ہوتا ہے۔ نقاد اس خصوصیت کو حقیقت نگاری یا واقعیت نگاری کہتے ہیں۔ لیکن واقعیت نگاری کے بھی کئی مدارج ہوتے ہیں۔ جن مصنفوں کو ہم حقیقت نگار کہتے ہیں ان میں بہت کم ایسے ہوں گے جن کا ہاتھ حقیقت کی نقاب کشائی کرنے میں کسی نہ کسی پردے تک پہنچ کر رک نہ جاتا ہو۔ جو کبھی نہ کبھی اپنی جھجک یا پڑھنے والوں کی رعائت سے واقعیت کے بہت سے مقامات سے آنکھیں بچ کے گزر نہ جاتے ہوں۔ بیشتر مصنف حقیقت کی درشتی میں اتنا لوچ ضرور پیدا کر لیتے ہیں کہ پڑھنے والے کی سطح ذہن پہ ان کی تحریر کا سفینہ غیر ضروری ہچکولوں کے بغیر گزر جائے۔ خدیجہ مستور اس بارے میں پڑھنے والے سے بہت کم مفاہمت کرتی ہیں۔ ابتدائی افسانوں میں ان کی یہ ہٹ دھرمی اور بھی واضح اس لئے ہے کہ انہوں نے سچ بولنے کے لئے موضوع بھی ایسا تلاش کیا جس کے متعلق ہم ہمیشہ سے جھوٹ سننے کے عادی ہیں۔ یعنی عورت مرد کے جنسی تعلقات اور محسوسات، اس معاملے میں وہ دانستہ اور نادانستہ دغابازیاں اور ریاکاریاں جو مرد عورت ہمیشہ ایک دوسرے سے کرتے چلے آئے ہیں۔ ہماری ذہنی، جذباتی اور سماجی زندگی میں اس قدر پیوست ہو چکی ہیں۔ کہ ان کی پردہ داری مشکل بھی ہے، مقبول بھی، خدیجہ مستور نے اس بارے میں بہت

سفاکی سے کام لیا ہے جس کے لئے غالباً مرد عورت میں سے کوئی بھی ان کا شکر گزار نہ ہو گا۔ لیکن اس سفاکی کے باوجود ان کے افسانوں میں درشتی، مردم بیزاری اور انسان دشمنی کا تاثر قریب قریب ناپید ہے۔ اس لئے ناپید ہے کہ خدیجہ مستور کو انسانی دکھ اور مصیبت سے بہت لگاؤ ہے۔ اس لگاؤ کی وجہ سے "بوچھار" اور "چند روز اور" کے جملہ افسانے ایک خاص نوع کے سوز اور رقت کا احساس دلاتے ہیں۔ یہی خدیجہ مستور کے افسانوں کی دوسری خوبی ہے۔ جنسی معاملات کی منظر کشی میں بھی ان کی نظر لذت کے کسی پہلو کے بجائے ہمیشہ دکھ کے کسی پہلو پر پڑتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے جنسی افسانے واقعیت کے باوجود عریاں نہیں ہیں۔ اور ان کا صحیح مقصود جسم و دل سے مجبور مخلوق سے ہمدردی ہے۔ ان کا استہزا ام نہیں ہے۔

اس سوز اور ہمدردی کا اظہار مصنفہ عام طور سے دو طرح کرتی ہیں۔ پہلی بات یہ ہے کہ خدیجہ کے افسانوں کا منظر عام طور سے نچلے درجے یا ہمارے مفلس طبقوں کے گھٹے ہوئے فلاکت زدہ گھر ہوتے ہیں۔ اور انہی طبقوں سے ان کے بیشتر افراد تعلق رکھتے ہیں۔ بھوک، بے بسی، ناداری اور بے سروسامانی کا مستقل پس منظر افسانوی افراد کی چال ڈھال اور افعال و اعمال میں اس طرح جھلکتا رہتا ہے کہ ان کی کوتاہیوں اور کمزوریوں سے ہمدردی کئے بغیر نہیں بنتی۔ دوسری بات یہ ہے کہ مصنفہ ان کوتاہیوں کو بے نقاب کرنے میں کسی پر حکم بن کر نہیں پہنچتیں نہ ان سے کبھی نفرت اور بیزاری کا اظہار کرتی ہیں۔ عام طور سے وہ عورت مرد کے جنسی اخلاق کو سماجی ماحول سے اتنا مربوط ضرور کر دیتی ہیں کہ اپنے افعال کے لئے افراد

کی ذمہ داری بہت حد تک کم ہو جاتی ہے۔

خدیجہ مستور کے افسانوں کی تیسری خصوصیت جزئیات سے ان کا شغف ہے وہ مصوری کم کرتی ہیں اور کشیدہ کاری زیادہ، شاید اسی مناسبت سے ان کی ابتدائی کہانیوں کا ظرف بھی محدود ہے۔ محسوس یہ ہوتا ہے کہ افسانہ نگار نے دوربین سے کسی وسیع منظر کو سمٹانے کی کوشش نہیں کی۔ بلکہ خوردبین سے ایک نقطے کو پھیلانے کی کوشش کی ہے یہ خوبی بھی ہے اور خرابی بھی۔ خوبی اس لئے کہ یہ طریقہ افسانہ نگار کے مخصوص فن کیلئے نسبتاً زیادہ موزوں ہے خرابی یہ کہ اس سے پڑھنے والے کو کشادہ دل و دماغ کا وہ احساس نہیں ہوتا جو ادب عالیہ کی سب سے اہم ودیعت ہوا کرتی ہے۔ جزئیات نگاری بیشتر زبان و بیان کی چابکدستی پر انحصار رکھتی ہے اور اس میدان میں خدیجہ مستور یقیناً کمال رکھتی ہیں۔ ان میں ہماری چند اور معروف لکھنے والیوں کی سی چمک اور تیکھا پن تو ہے، ان کی سی یکرنگی اور انتراہٹ نہیں ہے۔

ان میں سے بیشتر باتیں خدیجہ کے نئے اور پرانے افسانوں میں مشترک ہیں — واقعیت یا یوں کہئے کہ پردہ دری کا شوق جیسا انہیں پہلے تھا اب بھی ہے۔ ان کے افراد اب بھی مجبور اور بے کس مخلوق ہے جو پہلے تھی، تفصیلات اور جزئیات کو اجاگر کرنے میں اب بھی ان کی نگاہ وسیع ہے، زود رس ہے۔ لیکن اب ان کے سماجی اور فنی تصوّر میں پہلے سے نمایاں فرق دکھائی دیتا ہے۔ اب انہیں محض جنسی جبر وستم، محض جذباتی فریب اور ریاکاری، محض نجی الجھنوں اور گھریلو سازشوں کے علاوہ ان بنیادی حقائق سے بھی آشنائی ہو چلی ہے۔ جن کی وجہ سے جملہ

ذہنی، جذباتی اور سماجی امراض پیدا ہوتے ہیں۔ وہ اسباب جو مرد کو ظالم اور ہوسناک، عورت کو محکوم اور مقہور، گھروں کو تاریک اور بے رونق اور گھرانوں کو جھگڑالو اور خود غرض بناتے ہیں، محض افراد کے تجزیہ اور مطالعہ سے سمجھے یا سمجھائے نہیں جاسکتے۔ اس لئے کہ ان کی جڑیں کسی مخصوص سماجی نظام اور طبقاتی ترتیب میں پیوست ہوتی ہیں۔

"چند روز اور" میں مصنفہ نے انہی زیادہ اہم اور وسیع تر مسائل کی طرف رجوع کیا ہے۔ جو یقیناً ارتقاء کی اگلی منزل ہے۔ طبقاتی تعلقات اور ان کے سیاسی نتائج یعنی امن، جنگ، فسادات، تعیش اور ناداری، شقاوت اور خلوص، افراد اور واقعات کو کس طرح مختلف صورتوں میں مرتب کرتے ہیں۔

"چند روز اور" کا بیشتر موضوع یہی ہے۔ یہ ضرور ہے کہ خدیجہ مستور کو اس نئے مواد کی تراش خراش میں بھی اتنا ملکہ پیدا نہ ہوا جتنا انہیں اپنے ابتدائی موضوعات پر ہے۔ اس لئے انہیں کبھی کبھی واقعات سے ہٹ کر تفسیر و تشریح سے کام لینا پڑتا ہے۔ مثال کے طور پر فرقہ وارانہ فساد کا المیہ "مینوں لے چلے بابلا" میں افسانوی واقعات بغیر کسی تشریح کے نہایت موثر طور سے واضح ہوتے ہیں۔ لیکن "ٹانک لوٹیے" میں یہی کچھ بتانے کے لئے طویل مکالموں سے کام لینا پڑتا ہے۔ جس کی وجہ سے فلمی گیتوں کی طرح کہانی کی حرکت اور رفتار رک جاتی ہے۔ اسی طرح ان افسانوں میں افلاک زدہ طبقے کی جہد حیات کا سوز اور دکھ بہت شدّت سے محسوس ہوتا ہے۔ لیکن اس جدوجہد کا شکوہ اور جلال ٹھیک نہیں دکھائی دیتا۔

ان بنیادی مسائل سے مکمل فنی اور ذہنی تطابق پیدا کرنے کے لئے خلوص وقت اور محنت تینوں درکار ہوتے ہیں۔ خلوص موجود ہے۔ (جو چندر وزا اور "میں یقیناً" موجود ہے)، تو فن کی باقی منازل تک پہنچنے کے لئے گامزن رہنا ہی کافی ہے۔ اس لئے اردو ادب کے شائقین نہ صرف افسانوں کے اس مجموعے سے اپنے دیرینہ تجسس کی تسکین پائیں گے بلکہ خدیجہ مستور کے اگلے مجموعے کا اور بھی تجسس سے انتظار کریں گے۔

فیض احمد فیض

چلی پی سے ملن

دوسری جنگ عظیم کو چھڑے دو تین برس گزرے تو بمبئی میں بظاہر تل دھرنے کی جگہ نہ رہ گئی تھی، پھر بھی پتہ نہیں کہاں کہاں سے انسانوں کے سیلاب اُمنڈے چلے آرہے تھے۔ یہ سیلاب دو قسم کے ہوتے، ایک تو وہ جو دولت سے لدا پھندا ہوتا اور دوسرا وہ جو خالی اینٹھتا ہوا معدہ اور بھبھوڑتی ہوئی آنتوں کی وجہ سے بالکل ہلکا پھلکا ہوتا ــــ یہ زمانہ بھی بڑا عجیب تھا۔ اور ہندوستان میں تو خیر سے ہمیشہ کچھ عجیب ہی زمانہ رہے، مگر یہ تو سب پر فوقیت لے گیا تھا ــــ ایک طرف کاروبار کو دھڑے سے چمکا یا جا رہا تھا تو دوسری طرف روٹی کا ایک ایک ٹکڑا اتنا کا سا بہ ہو رہا تھا۔ اس کے علاوہ شہروں میں رہنے کی جگہ بھی نہ تھی اور پھر بمبئی ــ اگر جگہ تھی بھی تو بہت تنگ۔ پگڑیاں

اچھل رہی تھیں۔

ایک فلیٹ کی پگڑی دس ہزار — مالک مکان اپنے فیصلے پر نظر ثانی نہ کرتا۔

"ایک ننھے سے کمرے کی پگڑی تین ہزار ہوگی" — مالک بے اعتنائی سے فیصلہ کرتا، خدا نے اس پر جنگ کی برکتیں نازل کی تھیں، دولت آباد ہو جاتی۔ اور افلاس سڑکوں پر مارا مارا پھرتا۔ پھر بھی سیلاب آتے رہتے۔ مگر کم بخت کوئی بھی یہ گُر سیکھ کر نہ آتا کہ اگر زمین پر رہنے کی جگہ نہ ملے تو معلق کیوں کر رہا جا سکتا ہے۔ شاید افراتفری اور بھوک اتنا موقع ہی نہ دیتی ہوگی بے چاروں کو اور پھر ایسی حالت میں بھی کون سوچے جبکہ ہر شخص جانتا تھا بمبئی بہت بڑا شہر ہے اور بہت بڑا تجارتی مرکز ہے۔ وہاں ملوں کی بے شمار چمنیاں رات دن گاڑھا سیاہ دھواں اگلتی رہتی ہیں، وہاں دولت کی ریل پیل ہے، دولت آتی تو تجارتوں میں لگ جاتی۔ مگر غریب ننگے بھوکے آتے تو مل انہیں اپنے سایۂ عاطفت میں چھپا کر ان سے چالاک لومڑی جیسا سلوک کرتے، وہ دولت میں اضافہ کرتے اور بدلے میں چمنیوں سے نکلتا ہوا گاڑھا سیاہ دھواں ان کے چہروں پر مل دیا جاتا۔ اور وہ آہستہ آہستہ ایک دائمی شام بن کر رہ جاتے، جنہیں چمکیلی صبح کا منہ دیکھنا نصیب نہ ہوتا۔

اور انسانوں کے ایسے ہی ایک سیلاب میں اپیّا اور اس کا ننھا سا خاندان بھی آ پڑا۔ ان کا ننھا منا سا گاؤں جنگ کی تباہ کاریوں کا نشانہ بن گیا تھا۔ جنگ ہندوستان میں نہ ہو رہی تھی، مگر یہ بات بھی نہ تھی کہ ہندوستان اپنے آقا کا وفادار تھا۔ جنگ کے اثرات کہیں زیادہ بڑی جنگ کر رہے تھے، ہر طرف مہنگائی، بھوک۔

اور افلاس لوگ بے موت مر رہے تھے۔ زندہ رہنے کی جد وجہد کون نہیں کرتا۔ موت کو سامنے دیکھ کر کس کا جی نہیں چاہتا کہ بھاگ کھڑا ہو۔ وہ بھی زندہ رہنے کے لئے شہر کی طرف بھاگ آئے تھے۔ لیکن یہاں کہیں سر چھپانے کو جگہ نہ مل رہی تھی۔ یہاں پگڑیاں مانگی جاتی تھیں۔ اور ان کے پاس تو تن ڈھانکنے کے لئے ڈھنگ کی قمیض اور ثابت چولی بھی نہ تھی۔ بہت دن بھٹکنے کے بعد انہیں بیٹھنے کا ٹھکانہ ملا۔

مضافات بمبئی میں نہ جانے کتنے مزدوروں کے جھونپڑے پڑے ہوئے تھے۔ اپّا کے خاندان کو جو جگہ ملی۔ وہاں اسی کے ہم قوم گھاٹی بستے تھے۔ سڑک کے کنارے ایک چھوٹا سا میدان تھا۔ جو پہلے ملبہ سے اٹا پڑا تھا۔ مالک زمین کا ارادہ تھا کہ وہاں بھی ایک ہی نمونے کی چند بلڈنگیں بنوائے گا۔ مگر پھر نہ جانے کیوں اسکیم فیل ہو گئی۔ اس نے یہ زمین مزدوروں کو جھونپڑے ڈالنے کے لئے معقول معاوضے پر دے دی تھی۔ اس طرح اس نے مزدوروں سے ہمدردی بھی کی اور زمین بھی خواہ مخواہ خالی نہ پڑی رہی۔ آم اور گٹھلی کے دام، دونوں نصیب ہو گئے۔ اپّا کے باپ نے بھی مالک سے بات کر کے دوسرے ہی دن اپنا جھونپڑا کھڑا کر لیا۔ بانس کی کھپچیوں کی دیواریں اور ٹین کی چھت جھونپڑے میں صرف اتنی ہی جگہ تھی کہ دو چھوٹے چھوٹے پلنگ بچھ جائیں۔ تھوڑا بہت ضروری سامان بھی رکھ لیا جائے۔ جھونپڑوں میں عورتیں سوتیں۔ اور باہر مرد، برسات ہوتی تو خاندان کے خاندان ننھے ننھے جھونپڑوں میں تلے اوپر گرتے اور رات رات بھر الوؤں کی جانشینی کرتے۔

بیٹھنے کا ٹھکانہ کر کے جب اینا نے اطمینان سے اپنے گرد و پیش دیکھا تو اسے
یہ جگہ ذرا بھی اچھی نہ لگی۔ کچھ دور سامنے لوکل ٹرینوں کا چھوٹا سا اسٹیشن تھا۔ جہاں
ہر دس منٹ کے بعد چھوٹے چھوٹے ڈبوں کی خوبصورت ٹرینیں آتی جاتی رہتیں۔
کتنے ہی اترتے اور کتنے ہی سوار ہوتے۔ پھر چند منٹوں کے لیے اسٹیشن کا سائبان
خالی ہو جاتا۔ اور ہر طرف سناٹا چھا جاتا۔ اسٹیشن سے ایک پتلی سی کچی سڑک میدان
کے پاس ہوتی ہوتی چوڑی شفاف سڑک کے کنارے ختم ہو جاتی تھی۔ کچی سڑک
پر ہر وقت لوگ آتے جاتے رہتے تھے۔ مگر صبح منہ اندھیرے اور شام کو تو میلے کچیلے
آدمیوں کا وہ ہجوم ہوتا کہ شانے سے شانہ چھلتا۔ صبح ملوں میں جانے والے
مزدور ہاتھوں میں ننھی ننھی پوٹلیاں اور المونیم کے کٹورہ دان تھامے تیزی سے
اسٹیشن کی طرف جاتے ہوئے دکھائی دیتے۔ اور شام کو تھکے تھکے لڑکھڑاتے
قدموں سے واپس ہوتے۔ میدان کے پاس چھ نئی خوبصورت جہاز جیسی
بلڈنگیں بنی ہوئی تھیں۔ جن میں کرائے دار بسے ہوئے تھے۔ بلڈنگوں کے ارد گرد
ناریل کے اونچے اونچے درخت تھے۔ بلڈنگوں کے احاطے میں قسم قسم کے پھول
لگے ہوئے تھے۔ اور وہاں ایک بڑی عجیب پر اسرار سی خاموشی ڈیرے ڈالے
رہتی تھی۔ شفاف چوڑی سڑک پر وقفے وقفے سے بے حد خوبصورت کاریں
زن سے بھاگتی نظر آتیں۔ کبھی کبھی وکٹوریہ اور بسیں بھی سڑک کے کنارے دونوں
طرف فاصلے سے خوبصورت بنگلے اور بلڈنگیں بنی ہوئی تھیں۔ ان میں سے زیادہ
نئی تھیں۔ اور زمانہ جنگ کی پیداوار۔ تاکہ بیچارے کھاتے پیتے لوگ مارے مارے
نہ پھریں۔ میدان کے پاس ہی سڑک کے کنارے ایرانی کا ایک بڑا اچھا ہوٹل

تھا۔ جہاں قسم قسم کے لوگ آتے جانے رہتے۔ اور ہوٹل کے ریڈیو پر گیت
ہوتے رہتے یا پھر مدھم مدھم آرکسٹرا بجتا رہتا، پھر بھی یہ رومانی سی جگہ اپتا کو اچھی
نہ لگی تھی۔ شاید اس لئے کہ آخر وہ تو ایک اجاڑ میدان میں پڑی تھی۔ جہاں
کی کنکریلی زمین۔ اونچی نیچی تھی۔ جہاں دھواں دیتے ہوئے ٹینوں کے جھونپڑے تھے
اور میلے چیکٹ کپڑوں میں ملبوس فق چہروں والے انسان۔ پھر بھلا کہیں ایسا بھی
ہوتا ہے کہ بے حد بھوکا کھانے کے خیال سے ہی آسودہ ہو جائے۔ دوسرے یہ
بات بھی تھی کہ اپتا کا پرانا دوست اس کے ساتھ نہ آسکا تھا۔ ورنہ شاید یہ آس پاس
کے حسین مناظر کچھ لطف دے جاتے۔ وہ تو جبب سے یہاں آئی تھی۔ ایک سال گاؤں
یاد آرہا تھا۔ اس کا اپنا چھوٹا سا لپا پتا گھروندا جہاں وہ پلی بڑھی اور جوان ہوئی۔
اور اپنا گاؤں، جہاں ناریلوں کے بے شمار درخت تھے۔ شفاف ندی تھی۔ آموں
کے درختوں کا گھنا سایہ تھا۔ جہاں لہلہاتے ہوئے کھیت تھے۔ کیلوں کے باغ تھے
جہاں اس کے باپ کی آئینوں سے سجی ہوئی چھوٹی سی دکان تھی۔ جس میں رنگ برنگی
چوڑیاں لٹکی ہوئی تھیں، کلپ، کانٹے، اور جوڑوں میں لگانے والے پھلکے کے گجرے
تھے، رنگ برنگی چولیاں تھیں، منہ دھونے کا لال ہرا صابن تھا۔ اور اس کے باپ
کی دکان خوب چلتی تھی۔ اور لوگ خاصی طرح کھاتے پیتے تھے، مگر پھر جنگ چھڑ
گئی اور جیوں جیوں دن بیتتے گئے، جنگ ہر طرف جھاڑ دپھیرنے لگی۔ اس کے باپ
کی دکان سارا سارا دن منہ کھولے گاہکوں کا انتظار کرتی رہتی۔ پر آنے والا کون
تھا۔ کھانے ہی کو نہ تھا تو پھر یہ اوپر کی ٹیم ٹام کہاں سے ہوتی ——
فصلیں پکتیں، کاٹی جاتیں، اور پھر جانے کہاں غائب ہو جاتیں

گاؤں کی رونق بھی دھان گندم کے دانوں کی طرح غائب ہوگئی - ایسا معلوم ہوتا کہ گاؤں میں چڑیلیں آہیں بھرتی پھر رہی ہیں، لوگ خائف تھے مگر ایتا کو ان باتوں کی زیادہ پرواہ نہ تھی۔ - وہاں دیپ تھا - وہاں گنگناتی ندی تھی - اور وہاں کیلوں کے درختوں کا وہ ہلکا ہلکا اندھیرا تھا - جہاں وہ دیپؔ سے ملا کرتی تھی، اور اب اسی اندھیرے کی یاد اس کی نظروں میں دنیا تاریک کئے دے رہی تھی اسی لئے وہ پہلے ہی دن پھوٹ پھوٹ کر روئی تھی - حالانکہ اسے معلوم تھا کہ دیپؔ نے مصیبت کے دنوں میں اپنا مکان مہاجن کے پاس گروی رکھ دیا تھا - اور وہ اس کا قصہ چکا کر جلد ہی آجائے گا - مگر محبت میں ذرا سی دوری بھی کیسی پاگل کر دینے والی ہوتی ہے، اس لئے جنگ کی تباہ کاریوں کا سب سے عظیم الشان کارنامہ یہی تھا - کہ دیپؔ اس سے جدا ہو گیا تھا - اس نے اس دن رو دھو کر جنگ کرنے والوں کو خوب کوسا تھا - اور پھر گھنٹوں سوچا تھا - کہ بھلا جنگ کیوں ہوتی ہے۔ اس سے کیا فائدہ ہوتا ہے - لوگ مرتے کٹتے ہیں اور بس - لیکن ایتا کو کون بتاتا کہ صرف لوگوں کے مرنے کٹنے کے لئے جنگ نہیں ہوتی - جنگ اس لئے ہوتی ہے کہ مرنے کٹنے والوں کی لاشوں پر بڑے ٹھاٹھ دار سونے کے محل تیار ہو جاتے ہیں - ایسے محل جو وہ خواب میں بھی نہیں دیکھ سکتی۔

میدان کی پہلی رات ایتا پر بڑی بھاری گزری - رات کو نو دس بجے کے قریب جھونپڑوں سے باہر گھاٹیوں نے دو تین ٹولیاں بنائیں - اور تاڑی پینے لگے - جب خوب اچھی طرح نشہ آگیا تو کوئی لہک کر گانے لگا - کوئی سسک سسک کر رونے لگا - کوئی آستین چڑھا کر بے تحاشہ گالیاں بکنے لگا - اور ایک آدمی نے تو اپنی پیاری

سی گدرے گدرے جسم والی عورت کو دھوئیں دھوئیں پٹینا شروع کر دیا۔ عورت کے بچے رونے چیخنے لگے۔ مگر عورت عادی قسم کے مجرموں کی طرح اطمینان سے پٹتی رہی۔ دوسری عورتوں نے بڑی مشکل سے بیچ میں پڑ کر اسے بچایا لیکن مرد اپنے منہ پر تھپڑ مار مار کر چیخنے لگا۔ اور بیوی کے راز افشا کرنے لگا۔ کہ اس کی عورت اسے بے وقوف بناتی ہے، اس سے کہتی ہے کہ تم کمزور ہو گئے ہو۔ مل جانا چھوڑ دو۔ میں تمہارے لئے کہیں سے پیسے لاؤں گی۔ تم پھل کھاؤ، مجھے تم سے محبت ہے تم مجھے جان سے زیادہ عزیز ہو، مگر وہ اس کے پاس نہیں آتی، روز رات چپکے سے کوٹھیوں میں چلی جاتی ہے، فوجیوں کے ساتھ اڑ جاتی ہے۔ اور اسے پیسے دے کر ٹرخا دیتی ہے۔ لیکن وہ مل جانا چھوڑ چکا ہے۔ اور پھل بھی نہیں کھاتا، وہ صرف تاڑی پیتا ہے اور اس غم میں شدت سے پیتا ہے کہ اس کے پاس نہیں آتی ——— اور اتنا سب کچھ کہہ دینے کے بعد وہ سسک سسک کر رونے لگا پٹی ہوئی عورت نے بڑی بیتابی سے اپنی ساڑھی کے آنچل سے اس کے آنسو پونچھنے لگی۔ ایسا معلوم ہوتا کہ جیسے وہ پٹی ہی نہ تھی، اسے یہ مار بُری ہی نہ لگی تھی۔ لیکن وہ روئے چلا جا رہا تھا۔ پھر عورت بھی اس کے ساتھ رونے لگی۔ اور تمام مدہوش بھی رونے لگے۔ ایسا معلوم ہوتا کہ وہ سب کا اپنا دکھ ہے۔ رات کے سناٹے میں رونے کی آوازیں ایسی خوفناک لگ رہی تھیں کہ توبہ! لیکن جب پاس کی بلڈنگ کے ایک فلیٹ کی کھڑکی کھلی۔ اور ایک موٹے سے چہرے نے گرج کر کہا۔ کہ اگر سالے چپ نہ ہوئے تو پولیس کو دے دیا جائے گا۔ تو وہ سب سالے ایک دم چپ ہو گئے۔ سالیوں نے اپنے بچوں کو سینوں سے لگا لیا۔ اور پھر تاڑی کا نشہ اندر ہی

وہ سوچ ہی کیا سکتی تھی۔ اسے پتہ ہی کیا تھا۔ کہ دو چیزیں بڑی خطرناک ہوتی ہیں۔ سرمایہ جمع کرنے کا ہتھکنڈہ یا جو ساری دنیا کو ہڑپ کر جانے کی سوچنے لگتا ہے، اور بھوک جو اپنا سب کچھ بیچ کر پیٹ کی آگ بجھانے کی سوچا کرتی ہے۔ آخر تو بھوک جمع شدہ سرمائے کی کوکھ سے جنم لیتی ہے۔ مگر وہ تو بس انہیں دل ہی دل میں برا بھلا کہا کرتی۔

میدان کی زندگی کے کافی دن گزر گئے۔ ایتا کا باپ مل میں نوکر ہو گیا تھا، مگر مزدوری چھ جانوں کا پیٹ بھرنے سے قاصر تھی۔ ادھر مصیبتیں تھیں کہ "گھٹنے" کے بجائے دندناتی بڑھتی چلی آتیں۔ باپ کمزور ہوتا جا رہا تھا۔ پرانی کھلائی ستانہ چھوڑ چکی تھیں۔ ایتا کا کسا ہوا جسم بھی پلپلا چلا تھا۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑنے لگے تھے۔ اور گیہوں رنگ سنولا گیا تھا۔ بھائی بہن مرجھا گئے تھے۔ بڑھتے ڈیل بارھ مار گئے تھے۔ مگر سب سے بُرا حال اس کی ماں کا تھا۔ وہ ہمیشہ کی روگی تھی۔ علاج اور اچھی غذا کے بل پر کام کاج کر تی تھی۔ مگر اب بالکل ہڈیوں کا ڈھانچہ ہو گئی تھی۔ حد سے زیادہ چڑچڑی۔ جھونپڑوں والوں کی تکیہ کلام گالیاں اسے بھی یاد ہو گئیں وہ جب ایتا اور دوسرے بچوں سے ناراض ہوتی تو سالہ سالی کے خطاب سے نوازتی رہتی۔ ادھر کچھ دن سے اس نے اپنی کھاٹ سے اٹھنا اور کام کرنا چھوڑ دیا تھا۔ وہ اپنے منہ پر بھنکتی ہوئی مکھیاں بھی مشکل سے اڑاتی۔ اور خرگوش جیسے موٹے موٹے چوہے برتنوں میں کودتے تو وہ "ہش" بھی نہ کرتی۔ اگر کسی وقت اٹھتی تو جاکر دوسری عورتوں کے پاس بیٹھ جاتی۔ باتیں کرتی، گالیاں بکتی، اور جو بڑھیاں چرس پیتیں ان کے ساتھ خود بھی دم لگاتی۔ ایتا ماں کو دیکھتی تو حیران ہوتی۔

اس کی تبدیلی پر افسوس کرتی، اچھے دنوں کی یاد میں آنسو بہاتی اور پھر دیبی کو یاد کرتی یہ اس کی عادت ہو گئی تھی۔ کہ کام سے فرصت پائی تو دیبی کو یاد کرنا شروع کر دیا۔ غم سے فرصت چاہی، تو دیبی کو یاد کرنا شروع کر دیا۔ وہ ایتا کے لیئے ہر درد ہر مرض کی دوا تھا۔ اور اس طرح واقعی اس کا جی ہلکا ہو جاتا۔

اس دن ماں عورتوں کے پاس سے اٹھ کر آئی تو فوراً ہی ایتا سے تقاضہ کر بیٹھی کہ وہ بھی کسی صاحب کے ہاں نوکری کرے۔ اس طرح اس کے حصے کا کھانا بچے گا۔ اور دس بارہ روپے کے علاوہ انعام اکرام بھی مل جایا کرے گا۔ گھر میں بیٹھے بیٹھے روٹیاں توڑنے سے کیا تھا۔ ایتا نے سنا تو جیسے بھونچکا رہ گئی۔ ماں اسے نوکری کے لیئے کہہ رہی ہے! جیسے اسے یہ معلوم ہی نہیں کہ بنگلوں میں کام کرنے والی لڑکیوں کی عزت سے تو صاحب بہادروں کے پاس رہن رکھ جاتی ہے۔ لاکھ زور لگائے لیکن چھڑائے نہ چھٹے۔ ایتا نے تھوڑی دیر چپ رہ کر صاف انکار کر دیا کہ وہ نوکری نہ کرے گی۔ دوسرا کام چاہے ڈلیا ڈھونے کا ہو اگر لے گی۔ نہیں تو بھوکا مر جانا گوارا۔ ماں نے ٹکا سا جواب سنا تو ایک دم جھلا اٹھی۔ پہلے تو اسے برا بھلا کہتی رہی پھر رونے لگی۔ اپنی ایک ایک مصیبت گنا ڈالی ایتا کا دل پسیج اٹھا۔ وہ چپ چاپ ماں کے پاس سے اٹھ آئی۔ اور سارا دن سوچتی رہی کہ کیا کرے۔ اگر وہ نوکری کرے تو کیا کرے۔ انسان خود اچھا ہو۔ تو بھلا اس کا کوئی کیا بگاڑ سکتا ہے۔ وہ ان دوسری لڑکیوں کی طرح تو ہے نہیں جو اچھے بھلے راہ چلتوں سے کہتی ہیں۔ کہ دیکھو تم ہمیں چھیڑ نا مت ہاں ہم جانتے

ہیں کہ تم ہمیں ضرور چھیڑو گے ۔ اور پھر آخر بڑے سوچ بچار کے بعد اُس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ نوکری کرے گی ۔ رات جب وہ بستر پہ لیٹی تو اسے شدت سے احساس ہونے لگا کہ اگر وہ یہاں نہ آئی ہوتی، جنگ نہ چھڑتی تو کتنا اچھا ہوتا۔ وہیں اس کے گاؤں میں دیپی سے اُس کی شادی ہو جاتی اور پھر وہ بھی ایک گھر کی مالکن بن کر بیٹھتی۔ سوچ سوچ کر وہ بڑی دیر تک روتی رہتی ۔

جب وہ نوکری تلاش کر رہی تھی تو دیپی آگیا۔ وہ اپنا مکان بیچ آیا تھا۔ اور اس نے ایک سیکنڈ ہینڈ گراموفون بھی خریدا تھا۔ انیتا فوراً سمجھ گئی کہ یہ اُس کی بہت پرانی تمنا پوری کی گئی ہے ۔ اُس دن وہ بے حد خوش ہوئی ۔ اسے کوئی دکھ نہ تھا۔ اسے یہ جگہ بہت اچھی لگ رہی تھی ۔ اور شور و غل تو اسے یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے میلہ لگا ہے ۔ مارے خوشی کے اُس نے یہ بھی طے کر لیا کہ اب بھلا کون نوکری کرتا ہے ۔ صاحب بہادروں کی ۔ اسے صرف دیپی نے دیکھا ہے ۔ اور اسی نے چھوا ہے۔ وہ لال لال آنکھوں سے خود کو گھورواتے نہیں جاتی ۔

رات جب ناریل کے درختوں کے پیچھے چھپ کر وہ دیپی سے ملی تو اُس نے اسے سب کچھ بتا دیا۔ انتظار اور بیتا بیوں سے لے کر نوکری تک کی بات دیپی نے اسے بڑی تسلی دی کہ اب وہ آگیا ہے گھبرانے کی کوئی بات نہیں ساری مصیبتوں سے بچالے گا ۔ پھر اُس نے اپنے حساب ایک بڑی شاندار فلم کا ذکر کیا کہ کس طرح ایک ہیروئن کو ایک سیٹھ کے ہاتھ بیچا جا رہا تھا کہ عین وقت پہ ہیرو جا پہنچا۔ اور اس نے ہیروئن کو بچا لیا۔ اور پھر اپنا دیپی کے صدقے ہو ہو گئی ۔ بڑی دیر تک وہ ٹھنڈی چاندنی میں اس کی گود میں پڑی رہی۔ لیکن جب زیادہ وقت گزرنے کا

احساس ہوا تو اٹھ کر بھاگی ۔ باپ اور بھائی بہنیں سوئے پڑے تھے ۔ صرف اس کی ماں اپنی کھاٹ پر بیٹھی اونگھ رہی تھی ۔ اپنا مارے خوف کے کانپ گئی کہ اب ماں رات گئے واپس ہونے پر ناراض ہوگی ۔ ویسے ہی جلی ہو رہی ہے ۔ مگر ماں نے اسے دیکھتے ہی جب یہ پوچھا کہ وہ کتنے روپے لائی ہے اور کس کے پاس رہی تھی تو اپنا کے پیروں کے نیچے سے زمین کھسکنے لگی ۔ وہ رنج اور غصے میں لرزتی چپ چاپ اپنی سوئی ہوئی چھوٹی بہن کو کھاٹ کے ایک سرے پر سرکا کر لیٹ گئی ۔ اور ماں اسے دیر تک چپکے چپکے گالیاں دیتی رہی کہ جب کچھ لائی نہیں تو پھر گئی کیوں تھی ۔

صبح وہ برتن مانجھ رہی تھی اور اس کی ماں کھری کھاٹ پر لیٹی کھلے ہوئے بیاہ پیٹ پر سے میل کی بتیاں چھڑا رہی تھی کہ دیبی آ پہنچا ۔ تھوڑی دیر تک تو وہ بیٹھا گاؤں کی باتیں کرتا رہا اور ماں بڑے اشتیاق سے سنتی رہی پھر اس نے اپنے ساتھ اپنا کے بیاہ کی بات چھیڑ دی ۔ اپنا نے کنکھیوں سے اسے دیکھ کر ایسے زور سے پتیل کی تھالی پر راکھ رگڑی کہ چمک اٹھی ۔ مگر قسمت تو پتیل کی تھالی نہ تھی ۔ ماں کا چہرہ ناگواری سے بڑا ہبیبت ہو رہا تھا ۔ اس نے صاف انکار کر دیا کہ وہ اپنا کی شادی نہ کرے گی ۔ ابھی تو وہی اس کے دکھ درد کا سہارا ہے ۔ جب اپنا کا چھوٹا بھائی جوان ہو جائے گا تب کرے گا شادی ۔ دیبی نے بہت سمجھایا کہ وہ اس کی خدمت کرے گا ، لیکن نہ مانی ۔ اس نے کہہ دیا کہ وہ ایسی الو نہیں کہ سورج سے رات کو روشنی کی امید رکھے ۔ وہی شرط رہی کہ اپنا کا بھائی جوان ہو جائے تب ۔ دیبی رنج اور غصے سے لال ہوتے لگا تھا تو اپنا نے نظروں ہی

نظروں ہیں اسے سمجھایا کہ راضی ہو جائے۔ ایک دو سال میں بھائی مل جاتے یا پہاڑ ڈھونے کے لائق بھی ہو جائے گا۔ دیپ سر جھکائے چپ چاپ چل دیا۔

اپنا نے نوکری کر لی۔ مالک ایک مشہور رگانے والی تھی جو فلم کمپنیوں میں "پلے بیک" دیتی تھی۔ کافی موٹی مگر خوبصورت۔ وہ صبح تڑکے اٹھ کر کالی مرچیں اور نہ جانے کیا الم غلم کھا کر ہارمونیم کا ایک سر کھول کر گھنٹہ بھر ریاض کرتی تھی۔ اس وقت وہ ایسی عجیب عجیب آوازیں نکالتی کہ محسوس ہوتا غریب کو بڑی سخت تکلیف ہے۔ شدید کرب کا عالم طاری ہے۔ اس کے بعد وہ نہاتی دھوتی قیمتی ساری پہنتی اور دیر تک میک اپ کرتی اور پھر سرخ پردوں اور سبز صوفوں والے ڈرائنگ روم میں قسم قسم کے لوگ آنے لگتے۔ گراموفون پر اسی کے ریکارڈ لگا دیئے جاتے۔ اس کی آواز کی تعریفیں ہوتیں۔ اس کے فن کو سراہتے ہوئے زمین آسمان ایک کر دیئے جاتے۔ فن کی روح تک پہنچ پہنچ کر واپس ہوا جاتا، پھر اعلیٰ قسم کی شراب کے دور چلتے اور فن کی روح کو گانے والی کے جسم میں سرایت کر دیا جاتا۔ اس کے فوراً ہی بعد جسم کی پرستش شروع ہو جاتی۔ اور فن کہیں دور پڑا سسکیاں لیتا رہ جاتا۔ ذرا ذرا سے کام کیلئے اپنا کو بار بار بلایا جاتا۔ اور جب وہ گھبرائی ہوئی جاتی تو لوگ اسے تیز تیز نظروں سے گھورنے لگتے۔ کوئی نہ کوئی گانے والی کی آنکھ بچا کر اپنا کو آنکھ بھی مار دیتا۔ اور اس وقت وہ لوگ عورت کے سینے کی تو یوں باتیں کرتے جیسے پیاز، مولی، گاجر اور ٹماٹر کی بات ہو رہی ہے —— اپنا پندرہ دن کی تنخواہ چھوڑ کر گھر بیٹھ گئی۔ ماں نے اسے بڑی گھنی گھنی گالیاں دیں۔ پھر بہت سی چرس کے دم لگا کر خوب روئی۔ اپنا بھی خوب

روئی۔ اور رات بڑی دیر تک دیپی کے پاس بیٹھی رہی۔ دیپی نے اس سے بھاگ چلنے کو کہا مگر اپتا نے اپنے ہوش میں اس کی یہ بات ٹھکرا دی۔ اسے دلہن بننے، ڈھول تاشے کے ساتھ شادی رچانے کا شوق تھا۔ اور پھر وہ یہ جانتی تھی کہ بھاگی ہوئی لڑکی اور گھورے میں پڑا ہوا موتی دونوں برابر ہوتے ہیں دوسرے اسے اپنے باپ سے بے حد محبت تھی جو آج بھی اسے دیوتاؤں کی طرح پاک معلوم ہوتا تھا۔ اور جو اب اس سے اور بھی زیادہ پیار کا سلوک کرنے لگا تھا۔ اسے اپنے بھائیوں اور بہنوں سے بھی بہت پیار تھا۔ وہ اپنی ماں سے دور ہوتے ہوئے بھی بہت نزدیک تھی۔ اس نے دیر تک دیپی کو سمجھایا کہ اگر انسان خود اچھا ہو تو کوئی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ پھر رات جب وہ واپس لوٹی تو دیپی کے جھونپڑے میں ریکارڈ بجتے رہے۔ جیسے وہ شدتِ غم سے بچنے کے لیئے جی بہلا رہا ہو۔ اپتا دیر تک روتی رہی۔

اس نے دوسرا گھر تلاش کر لیا۔ دوسری مالک ایک بھینس جیسی موٹی اور کالی سیٹھانی تھی۔ اس کا بوڑھا شوہر عین جوانی کے عالم میں اسے داغِ مفارقت دے گیا تھا۔ وہ اس کی دولت کی تنہا مالک تھی اور اس نے ایک بے حد غریب لڑکا پال لیا تھا۔ لڑکا نوعمر تھا اور برسات کی رت کی طرح خوبصورت تھا۔ پر جانے کیا بات تھی۔ کہ اس کی آنکھوں میں برسات کی نمی اور گھٹاؤں جیسا اندھیرا چھایا رہتا۔ سیٹھانی ایک سخت معلمہ کی طرح اس کی نگرانی کرتی تھی۔ ایک منٹ کو بھی آنکھوں سے اوجھل نہ ہونے دیتی۔ باہر جانا ہوتا تو لڑکے کو ساتھ ہی لے جاتی اور جلد ہی واپس آجاتی۔ وہ کبھی زیادہ دیر باہر نہ رہتی۔ وہ بے حد خوبصورت کپڑے

پہنتی تھی اور بہت گہرا میک اپ کرتی تھی۔ ساتھ ہی "کالا تمباکو" کا پان کھاتی تھی، وہ بھی اتنی شدت سے کہ اس کے دانت کالے پڑ گئے تھے۔ مسوڑے نیلے پڑ گئے تھے جب وہ منہ کھول کر ہنستی تو سرخ لگے ہونٹوں کے اندر جھانکتی ہوئی بتیسی ایسی معلوم ہوتی جیسے گھناؤنے سیاہ زخم سے خون رس رہا ہو۔ ایتا سے وہ بہت مہربانی سے پیش آتی اور اسی لیئے ایتا کی رس بھری موٹی آنکھوں نے اس کی بدصورتی کو معاف کر دیا تھا۔ نوکر کافی تھے اس لیئے ایتا کے سپرد بہت معمولی سے کام تھے۔ کالا تمباکو کا پان لانا۔ لڑکے کے درجنوں جوتوں کو صاف کر دینا۔ اور کمروں کی جھاڑ پونچھ —— سیٹھانی کے علاوہ ایتا کو لڑکا بھی بڑا سیدھا معلوم ہوا۔ اس نے نہ تو کبھی ایتا کو آنکھ ماری اور نہ گھور گھور کر دیکھا۔ بس سیٹھانی کے پہلو میں دھنسا رہتا۔ ایتا یہاں خوش اور مطمئن ہوگئی۔ لیکن ابھی دس دن گزرے تھے۔ کہ سیٹھانی نے اسے بلایا اور رازداری کے سے انداز میں اسے اپنے پاس بٹھا لیا۔

"ایتا ہم تمہارا پگار جیادہ کر دیں گے، تم ہمارا ایک کام جیاتی کریں گا۔ ہم تمہارا پگار پچاس روپے کر دیں گا۔" سیٹھانی نے ایتا کا بھرا بھرا بازو تھپتھپایا اور بڑے پیار سے دیکھنے لگی۔

"بائی جی۔ ہم تمہارا سوب کام کرینگا" —— ایتا نے مارے ممنونیت کے سر جھکا دیا۔ اور سوچنے لگی۔ کہ دیویاں یقیناً ایسی ہی ہوتی ہوں گی۔

"تمہارا صاحب ہمارے کو بوت پیارا ہے" —— سیٹھانی نے سرگوشی کی۔ ایتا نے خوش ہو کر سوچا کہ ہر دیوی کو اپنا صاحب بہت پیارا ہوتا ہے اسے بھی اپنا دیپی پیارا ہے۔

"اور اب ہمارے کو نہیں مالوم اب وہ کیسا ہو گیا ہے۔ ٹھنڈی مٹی مانگ، پہلے بوت اچھا تھا۔ ہمارا امر جیادہ ہے اب تم اس کو چھوئیں تب اچھا ہو جائیں گا سالا۔ پر تم شریف مانگ اسے چھوئیں گا۔ آنکھ نہیں لڑائیں گا، تم بہت سیدھا ہے تب ہم تم کو اس کام کو بولا ہے۔ دوسرا سب چھوکری جو آیا چھنال تھا سالا۔"

بائی جی۔ ہمارا پگار دو ہم کام نہیں کریگا۔" ایتا نے سب سمجھتے ہوئے بڑی مشکل سے غصے پر قابو پایا مگر سیٹھانی پھونس میں لگی آگ ہو رہی تھی۔

"تم سالا لوگ بھوک چلاتا ہے، تم سالا لوگ جھوٹا ہوتا ہے۔ کام کبھی گا نوکر کرنے کا نہیں۔ تم بڑا سیتا ہے۔ اور درد پتی ہے تم سالا، نہیں ہے پگار" —— اور ایتا دس دن کی پگار چھوڑ کر گھر آگئی۔ اس دن ماں نے بے تحاشا گالیاں بکیں اور کچھ نہیں تو ایتا اسے سیٹھانی کے گھر سے ملا ہوا اچھا کھانا ہی کھلاتی تھی وہ بھی گیا۔ شاید اسی رنج میں اس نے پاس پڑی ہوئی لکڑی ایتا پر کھینچ ماری جو اس کے گھٹنے کو چھوتی ہوئی دور جا گری۔ ایتا دیر تک روتی رہی اور جب وہیں سے ہلی تو سب کچھ چھپا گئی وہ جانتی تھی۔ کہ اس بار دینی ضرور ضد کرے گا کہ بھاگ چلے مگر اسے تو شادی رچانے کا ارمان تھا۔ نوگز کی ریشمی ساری پہننے اور پھول لگا کر دلہن بننے کی تمنا تھی۔ اور پھر وہ ایسی پتھر کب تھی۔ کہ سب کو مصیبتوں میں چھوڑ کر چلی جائے۔

دو چار دن ایتا نے گھر بیٹھ کر گزار دیئے اور اس طرح کہ جیسے اب اسے کوئی کام کرنا ہی نہیں۔ لیکن جب ماں کی گالیاں بڑی خوفناک ہونے لگیں اور اس

کے آنسو ہر وقت بہنے لگے تو ایتا نے کوشش کر کے پھر کام ڈھونڈ لیا۔ تیسری مالکن بالکل لونڈیا سی تھی، گوری چٹی، پھیکا شلجم جیسی۔ صاحب ادھیڑ عمر کے کھائے کھیلے معلوم ہوتے تھے۔ پھر وہ دیکھتی کہ مالکن کو صاحب سے عشق ہے وہ صبح نو دس بجے چلے جاتے۔ اور شام کو چار پانچ بجے واپس آتے مالکن ان کے آنے سے ایک دو گھنٹے پہلے سنگھار شروع کر دیتی چہرہ اس خوبصورتی سے سنوارتی کہ سارا پھیکا پن غائب ہو جاتا۔ اگر صاحب کو کبھی آنے میں ذرا سی دیر ہو جاتی تو مالکن بڑی سخت بے چین ہوتی۔ نوکروں سے لے کر اپنی ننھی سی سفید بلی تک سے ناراض ہو جاتی۔ ایتا کو حکم دیا جاتا کہ باہر کھڑے ہو کر صاحب کی کار آتے دیکھے اور اسے اطلاع دے اور اگر ایتا سڑک کی طرف دیکھنے کے علاوہ کسی دوسری طرف دیکھتی ہوئی پکڑی جاتی۔ تو پھر اس کی خیر نظر نہ آتی۔ مالکن کی بدمزاجی نے ایتا کو شروع ہی میں بدل کر رکھ دیا۔ لیکن مالکن نے اسے ایک مہینے کی پیشگی تنخواہ دے کر اس کے پیروں میں بیڑیاں ڈال دی تھیں۔ ایتا کو یہاں بھی بہت کم کام تھا۔ زیادہ وقت وہ باورچی خانے میں بیٹھی رہتی۔ مالکن کا حکم بھی تھا۔ کہ نوکروں کی جگہ باورچی خانے میں ہے۔ ادھر ادھر پھرنے کی اجازت نہیں تھی، بس پورے وقت کوئلے کے جلنے کی بو سونگھو، دھواں کھاؤ اور لہسن پیاز کی جھار سے آنسو بہاؤ۔

مالکن کا پرانا باورچی اور بیرا ہر وقت آپس میں باتیں کرتے رہتے۔ ان کی باتوں سے اسے معلوم ہو گیا تھا۔ کہ اس کے صاحب پہلے بڑے بدمعاش تھے۔ ان کی ایک بیوی ایسے ہی سبز صوفوں پر بیٹھے بیٹھے خزاں کی نذر ہو گئی تھی۔ دوسری بیوی صاحب کا

کا انتظار کرتے کرتے بھاگ گئی تھی۔ لیکن اب صاحب کے کان ہو گئے تھے۔ وہ اپنے اس ڈھلتی عمر کے سہارے کا بہت خیال رکھتے تھے۔ لیکن مالکن کو کیوں کہ پہلے کی سب باتیں معلوم تھیں اس لیئے وہ صاحب پر بھروسہ نہیں کرتی تھی۔ ہر وقت بے چین ہر وقت تڑپی تڑپی سی۔

باورچی خانے کی فضا ایتا کو اچھی نہ لگ رہی تھی۔ باورچی بڑا بکواسی تھا۔ وہ ایک سانس میں ڈھیروں باتیں کرتا۔ بڑی بے ہنگم شرابیوں جیسی ہنسی ہنستا اور خوب کس کے گالیاں بکتا۔ اسے تو وہ بڑا بدمعاش معلوم ہوا۔ اور جب وہ اس سے مہربانی سے بولتا تو وہ اور بھی بدکتی۔ لیکن ایک دن جب بیرے نے ایتا کو آنکھ ماری تو باورچی نے اسے آڑے ہاتھوں لیا۔ جی بھر کے بیرے کو گالیاں دیں۔ نوکری سے الگ کرانے کی دھمکی دی۔ اور جب تک بیرے سے کان نہ پکڑوا لیئے پیچھا نہ چھوڑا۔ اس دن ایتا کو معلوم ہوا کہ یہ گالیاں بکنے والا بدمعاش جیسی صورت والا باورچی دل کا کتنا اچھا ہے۔ پھر جب وہ ایتا سے مہربانی کا سلوک کرتا۔ تو وہ بہت خوش ہوتی۔ کبھی کبھی اپنا دکھ درد بھی اس سے کہنے لگی۔ باورچی بچایا ہوا دودھ، ڈبل روٹی اور اپنے حصّے کا بھی تھوڑا سا کھانا ایتا کو زبردستی دے دیا کرتا۔ کہ وہ اپنے گھر لے جائے۔ ایتا انکار کرتی تو وہ بڑی شفقت سے اسے بہت سی گالیاں دیتا پھر ایتا کو لینے ہی پڑتی۔

اسے یہاں رہتے ہوئے ایک مہینہ ہو گیا۔ وہ باورچی کی محبت اور شفقت کے سائے میں بڑی خوشی اور حفاظت محسوس کرتی تھی لیکن ادھر اسے اس مسرت سے بھی بے نیاز ہو جانا پڑا۔ دو چار دن سے وہ دیکھ رہی تھی۔ کہ شام کو جب دیئے جل

سے واپس آتا تو جھونپڑوں کی کئی لڑکیاں اس کے جھونپڑے کے اردگرد منڈلانے لگتیں
چہلیں کرتیں، ریکارڈ بجانے کی فرمائش ہوتی۔ دیپی بھی ہنستا اور کبھی کبھی ریکارڈ بھی
بجا دیتا۔ ایتا کے سینے پر سانپ لوٹ جاتا۔ اس نے لڑکیوں کو جی ہی جی میں خوب
گالیاں دیں۔ دیپی سے بھی شکایت کی۔ مگر اس نے بڑے پیار سے اسے سمجھا
دیا کہ وہ دنیا کی ہر چیز کے بدلنے کا خیال کرے۔ مگر دیپی کے لیے یہ نہ سوچے۔ بات
کوئی نہیں ہے یہ صرف اس کا شبہ ہے ——— پھر بھی بات بڑھتی جا رہی تھی۔
ایک لڑکی جو ریشمی چولی پہنتی اور بڑے ٹھسے دکھاتی، دیپی سے گراموفون مانگ کر لے گئی
اور دیر تک اپنے جھونپڑے میں بجاتی رہی۔ ایتا کو بے حد دکھ ہوا۔ وہ دیپی کے جھونپڑے
اور اس کی ہر چیز کا مالک اپنی ذات کو سمجھتی تھی۔ پھر مالکن سے کچھ پوچھے
بغیر اس کی چیزیں ادھر ادھر ہونے لگیں۔ کیسے دکھ کی بات تھی۔ وہ ہر وقت رنجیدہ
رہنے لگی تھی۔ ایسے عالم میں جیسی کچھ مایوس کن باتیں سوچی جاتی ہیں بس وہی سوچا کرتی
یعنی یہ دنیا بھی کیا ہے، یہاں محبت کرو اور بدلے میں بے وفائی کے پتھر سر پر مار کر
پاگل ہو جاؤ۔ ایسی بہت سی باتیں۔ لیکن وہ یہ نہ سوچتی کہ اگر وہ اپنے خاندان کا پیٹ
پالنے کے لئے دیپی کی مسرتوں کا گلا کاٹ سکتی ہے تو آخر وہ بھی اس سے مایوس
ہو سکتا ہے۔ پھر غم و آلام کے اندھیرے میں اگر ذرا سی مسرت کی کرن نظر آ
جائے تو آخر ادھر کیوں نہ دوڑ پڑے پھر ایسی حالت میں جبکہ دوسری کرنیں پہلی کرن
سے بظاہر زیادہ چمک دار ہوں ——— وہ لڑکیاں شام کے وقت اپنی اکلوتی
اچھی ساریاں اور ریشمی چولیاں پہنتیں، کبھی کبھی جوڑے میں پھولوں کا گجرا لگا لیتیں۔ ان
کی حرکتوں میں لوٹ لینے اور چھین لینے کا گھٹیا پن تھا۔ تو کیا زندگی کا ثبوت تو دیتی

تھیں - ایک ایتا تھی - اجاڑ بال - غذا کی کمی سے مرجھایا ہوا چہرہ - مسکی ہوئی ایک د تہا
ساری جسے دھونے کی بھی فکر نہ ہوتی - دیپی کو جو حُسن اور جوانی دکھا چکی تھی - آج بھی اسی
کے پھندے میں گرفتار دیکھنے کی تمنا تھی - اور ہر وقت اسی غم میں گھلا کرتی - اسے
یوں اداس دیکھ کر باورچی پریشان ہوتا - اس سے لاکھ پوچھتا کہ کیا ہے - مگر وہ کچھ نہ بتاتی
ایک دن باورچی کھانا پکانے کے بعد ایتا کے سر ہو گیا -

"آج تو تجھے بتانا پڑے گا - کہ کیوں چپ رہتی ہے' اور نہ بتایا تو تیری ایسی
تیسی سالی" - باورچی نے بڑی شفقت سے ایتا کے سر پر ہاتھ پھیرا - ایتا پھوٹ پھوٹ
کر رونے لگی - اور جب ذرا جی ہلکا ہوا تو باورچی کو سب بتا دیا - کوئی راز دار ہو تو
غم بٹ جاتا ہے -

"اور اب ہم جندگی کو خلاص کر دینگا کھانساماں" ایتا نے اپنا فیصلہ سنا دیا -

"تو سالی زندگی ختم کرے گی - چوٹی پکڑ کر کھینچ لاؤں گا - تو بھی ٹھاٹ کر یہ اجاڑہ
صورت لے کر پھرتی ہے - نہ کھاتی ہے نہ پیتی ہے - خوب کھایا کر بہت سا' اور ایک
تنخواہ بچا کر ساری خرید ایک پھڑکتی سی چولی لے - اور سالی شرافت کو ایک طرف
رکھ دے - ناز نخرے دکھا اسے نہیں تو وہ سالیاں اسے جھٹک لے جائیں
گی باورچی نے ایک ہی سانس میں اسے اتنے بہت سے گر سکھا دیئے - ایتا
کے دل میں صرف ٹھاٹ کرنے کی بات لگ گئی -

پر کھانساں ایک پگاریں ساری کہاں سے آئیں گا ؟ ایتا نے بڑی
بے بسی سے کہا -

ایک تنخواہ تیری اور آدھی مجھ سے لے - قرض نہیں ویسے ہی لے ، سالی

تو میری بیٹی برابر ہے، اور پھر چل میرے ساتھ خریدنے "

"اور تو کیا کریں گا خالی جیب، ہم کو نہیں مانگتا تیری پگار" ایتا نے مارے محبت کے منہ بسور کر انکار کر دیا۔ لیکن جب خانساماں نے بہت سی گالیاں دیں تو ایتا راضی ہو گئی۔ دراصل وہ دل سے بھی یہی چاہتی تھی کہ اسے زبردستی راضی کر لیا جائے۔ پھر خانساماں نے اسے مکھن اور ڈبل روٹی کھلائی اور سر میں ڈالنے کے لئے اپنا گھٹیا قسم کا تیل دیا۔

پہلی تاریخ کو ایتا نے مالکن سے تنخواہ مانگی تو اسے معلوم ہوا کہ اس کی ماں پہلے ہی آکر تنخواہ لے جا چکی ہے۔ وہ خانساماں کے پاس آئی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ خانساماں تھوڑی دیر تک بالکل چپ بیٹھا رہا۔ ایسا معلوم ہوتا کہ اب تو وہ بھی بے بس ہے۔ اس کی بھی تو بیوی تھی اور بچے۔ شاید وہ یہی کچھ سوچ رہا ہوگا۔ جبھی اس نے ایک گالی بھی نہ دی۔ پھر ذرا دیر بعد اس نے ایتا کے آنسو خشک کئے۔ اس کے سر پہ ہولے ہولے تھپکیاں دیتا رہا۔ اس کے بعد اس نے اپنا صابن نکال کر دیا کہ وہ ساری دھو کر پہن لے۔

خانساماں نے ساری خریدنے کی پھر بات نہ کی۔ لیکن ایتا ہر وقت سوچا کرتی کہ وہ کیا کرے۔ ناریل کے درختوں کے پیچھے وہی اس سے کبھی کبھی ملتا مگر وہ محسوس کرتی کہ وہ بدل گیا ہے۔ اسے پہلی سی بات نظر نہ آتی۔ اسے ہر وقت یہی محسوس ہوتا کہ وہی اس کے ہاتھ سے نکلا جا رہا ہے۔ اسے بچانے کے لئے اس کو ٹھاٹ باٹ کی ضرورت ہے۔ وہ اپنی مالکن کو روز نئی نئی چمکتی ہوئی ساریاں پہنتے دیکھتی تو اس کے کلیجے میں ہوک اٹھتی اس نے ان دنوں اکثر ایسے خواب

دیکھے کہ مالکن نے اسے ایک ساری دے دی ہے جسے پہن کر وہ بالکل دلہن
معلوم ہو رہی ہے ۔ اور وہ دیہی سے ملنے گئی ہے ۔ لیکن جب آنکھ کھلتی
تو وہی بوسیدہ ساری اس کے جسم پر ہوتی جس کا رنگ روپ بگڑ چکا تھا ۔
خواب کی اس تعبیر پر اسے بڑا دھکا لگتا ۔ اور جب کچھ بن نہ پڑتا تو اپنی بدنصیبیوں
کی ذمہ داری ولیہ تاؤں کے سر ڈال دیتی ــــ یہ سب اسی کا کیا ہوا ہے کہ ایک کو
درجنوں ساریاں دے دیں ۔ کوٹھیاں اور کاریں بنا دیں کہ خوب ایکسیڈنٹ کرو
اور کسی کو ایک ساری بھی نہ دے ۔ ایک ڈھنگ کا جھونپڑا بھی نہ دیا ۔ اسے
ولیہ تاؤں سے بڑی سخت شکایت ہوتی ۔ اس بے انصافی پر اور اسے اصل بے انصافوں
کا پتہ بھی نہ چلتا ۔ حالانکہ ایک بار باورچی نے اس کی باتیں سن کر کہا بھی تھا کہ ، سالی ! خدا تو
سب کو ایک نظر سے دیکھتا ہے ۔ اس کا کیا قصور ، یہ سب انسانوں کا کیا دھرا
ہے ۔ لیکن اینا کو باورچی کی بات اچھی نہ لگی تھی ۔ گاؤں سے لے کر یہاں تک
جانے کتنے امیروں غریبوں سے یہی سنتی آئی تھی کہ سب خدا کی مرضی ہوتی ہے
جسے جو چاہے بنا دے ۔ اور باورچی خدا سے یہ حق چھین لیتا تھا ۔ جیسے انسانوں
کی طاقت خدا سے بڑھ گئی ۔

صاحب اور مالکن سینما کا آخری شو دیکھنے گئے ہوئے تھے ، خانساماں انگیٹھیوں
میں تھوڑے سے کوئلے جلائے بیٹھا تھا کیونکہ صاحب کھانا کھا کر نہیں گئے تھے ۔
اس وقت تک انتظار کرنا تھا ۔ اینا کھانا کھا چکی تھی ۔ اور اس کا جی چاہ
رہا تھا کہ بس اب جلدی سے بھاگے ۔ کہیں اسے جانے میں دیر نہ ہو جائے ۔ جو
دیہی انتظار کرتا ہوا چلا جائے ۔ اس نے خانساماں سے جانے کی اجازت مانگی

اور پھر حسب معمول جانے سے پہلے خواب گاہ میں جاکر صاحب اور مالکن کے بستر ٹھیک کرنے لگی۔ بستر کی شکنیں مٹا رہی تھی۔ لیکن اس کی ساری توجہ سنگھار میز کے قریب رکھے ہوئے اسٹول پر تھی۔ جہاں مالکن کی وہ ساری پڑی ہوئی تھی۔ جو سینما جاتے ہوئے اس نے تبدیلی کی تھی۔ ساری کا سنہرا کام بجلی کی روشنی میں کرن کی طرح چمک رہا تھا۔ ایتا نے ساری کو بڑے پیار سے چھوا اس کا ایک سرا سر پر ڈالا۔ اور پھر آئینہ دیکھا۔ کیسا خوبصورت لگ رہا تھا۔ ساری پہن لینے کی شدید تمنا جاگ اٹھی۔ اس نے سوچا کہ جب تک مالکن واپس آئیں۔ وہ یہ ساری پہن سکتی ہے۔ دیبی سے مل سکتی ہے اور ان کے آنے سے پہلے یہ ساری وہ باہر سے کھڑکی کے ذریعے اندر ڈال سکتی ہے۔ بھلا کسی کو کیا پتہ چلے گا۔ اس خیال کے ساتھ ہی اس نے خواب گاہ کے دروازے اندر سے بند کر لئے۔ جلدی جلدی مالکن کی ساری اور بلاؤز پہن لی۔ اس نے چوری نہیں کی تھی۔ پھر بھی اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ پاؤں کانپ رہے تھے۔ اس نے آئینے میں دیکھا اور فیصلہ کیا کہ وہ مالکن سے بھی اچھی لگ رہی ہے۔ اس نے تھوڑا پاؤڈر نکالا۔ اور منہ پر مل لیا۔ ابھی اچھی طرح ملنے بھی نہ پائی تھی۔ کہ خانساماں کی آواز آئی۔ ایتا ــــــ سالی ایتا ــــــ ایتا چوروں کی طرح دبے پاؤں بھاگی۔ خواب گاہ غسل خانے اور ادھر سے باہر۔ باہر جاکر وہ چپکے سے ناریل کے درختوں کے پیچھے رینگ گئی۔ دیبی وہاں نہ تھا۔ وہ اس کا انتظار کرنے لگی۔

پورا چاند جیسے وسطِ آسمان پر چمک رہا تھا۔ جھلاتی ہوئی ساری، پاؤڈر کی خوشبو اور دیبی کا خیال سے مدہوش کئے دے رہا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ جب

دیپ آئے گا تو اسے دیکھ کر کتنا خوش ہوگا۔ وہ اس سے کہے گا کہ اپیتا تو دنیا میں سب سے زیادہ خوبصورت ہے۔ وہ اسے ان چڑیل لڑکیوں کا طعنہ دے گی۔ پھر اس سے کہے گی کہ آج وہ اس کی دلہن بن کر آئی ہے۔ اور وہ اسے پیار کرے گا۔ لپٹائے گا تو وہ اسے ذرا بھی نہیں روکے گی آخر تو وہ اسی کی ہے ۔ لیکن جب بیٹھے بیٹھے نہ جانے کتنی دیر ہو گئی تو سارے رنگین خیال ہوا ہونے لگے۔ پرائی ساری جسم کو نہ لگ رہی تھی۔ اس پر یہ خوف کہ کہیں صاحب واپس نہ آجائیں جانے کتنی دیر ہو گئی ہوگی۔ جھونپڑ دن تک میں اب شور نہ ہو رہا تھا۔ پھر سوچتی کہ اب یوں ہی سب چپ ہوں گے۔ آج وہ جلدی آگئی ہوگی۔ دیپ کو کوئی کام لگ گیا ہوگا۔ وہ آتا ہی ہوگا۔۔۔۔"

جھونپڑوں کی طرف سے اچانک شور بلند ہوا۔ مالک کے بیرے کی تیز آواز آرہی تھی۔

"سالی۔ بائی جی کی ساری چرا کر لے آئی۔ صاحب پولیس میں دیں گے تب معلوم پڑیگا ۔

اپیتا یہاں نہیں ہے ۔ وہ ادھر ہی کہیں کو ہونگا۔ ساری وہ نہیں چرائیگا ادھر ہی رکھا ہوں گا۔ اپیتا کے باپ کی آواز آئی۔

"چور ہو تم سب سالو۔ صاحب تمہارا سب کا جھونپڑا ادھر سے ہٹا دیگا۔ اپیتا کو ڈھونڈنا مانگتا نہیں تو ابھی پولیس کو لائینگا۔ بیرے کی آواز بہت تیز تھی۔ اپیتا اپنی جگہ پر جیسے جمی بیٹھی تھی۔ سر چکرا رہا تھا۔ کانوں میں جیسے طوفانی آندھی کی آواز بھر رہی تھی۔ وہ خوف و دہشت میں لدی پھندی۔ بغیر کچھ سوچے ادھر سے

اٹھ کر بھاگنے لگی۔ اسے محسوس ہو رہا تھا۔ کہ جیسے کوئی اس کا پیچھا کر رہا ہے۔ اسے پکڑنے کے لیئے آ رہا ہے۔ وہ گانے والی کے بنگلے میں کھلا پھاٹک دیکھ کر گھس گئی۔ کمروں میں روشنیاں تھیں مگر باہر اندھیرا تھا۔ وہ گراج میں کار کے پیچھے چھپ کر بیٹھ گئی۔ دل قلابازیاں کھا رہا تھا۔ اور ابھی وہ دم بھی نہ لینے پائی تھی کہ جوتوں کی تیز چاپ ہوئی۔ پھر کوئی گراج میں آگیا۔ ٹارچ روشن ہوئی۔ ایتا نے دیکھا کہ وہ گانے والی کے ہاں آنے والوں میں سے ایک شخص تھا۔ جسے وہ دیکھ چکی تھی۔

"کون؟ او ایتا۔ یہ ٹھاٹ ہیں" اس نے ٹارچ کی روشنی میں اچھی طرح ایتا کا جائزہ لیا۔ اب اس کی چوری پکڑی گئی۔ اس خیال نے اسے بے ہوش سا کر دیا۔

"بیٹھے گی کار میں؟" آدمی نے آگے بڑھ کر اس کے سینے پر ہاتھ رکھ دیا۔

ایتا کے منہ سے کوئی آواز نہ نکلی۔

"پیاری میری جان" ــــــ آدمی نے اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اسے کار کے اندر دھکیل دیا۔ اور پھر کچی سڑک پر دو جھٹکے کھانے کے بعد کار زن سے پکی سڑک پر دوڑ گئی۔

نیا سفر

جاڑوں کے مسکراتے دن ننھے ننھے دن چمکتی ہوئی گرم گرم دھوپ، ناچتی گنگناتی فضائیں۔ جانے یہ سب کہاں اور کس کے لیے تھیں۔ یہاں تو ایسا لگ رہا تھا کہ دن روتے بسورتے پہاڑ ہیں۔ فضائیں اونگھ رہی ہیں۔ وقت کچھوے کی مانند رینگ رہا ہے اور ماحول میں ویران اداسی رچی ہوئی ہے۔ حالانکہ اس وقت تلے اوپر کے دونوں بچے صحن میں گولیاں کھیل رہے تھے۔ نشانہ غلط ہونے پر بعد بلکہ چھلے انداز میں رنگین گولیوں کو بھاری بھاری گالیاں دے کر خاصا ادھم مچا رہے تھے۔ بچوں کا باپ صحن کے ایک کونے میں پڑی ہوئی جھلنگا کھاٹ پر لیٹا ایک بیڑی سے دوسری بیڑی سلگا رہا تھا۔ وقفے

وقفے سے کھانستا، پھر کھنکارتا اور تلے اوپر رکھے ہوئے پاؤں زور زور سے ہلانے لگتا۔ بچوں کی ماں ایک ننھی سی جان کو سینے سے چپکائے دھوپ میں بیٹھی دودھ پلا رہی تھی۔ پھر کسی کسی وقت دودھ چھوڑ کر غوں غاں بھی کر رہا تھا اور بچوں کی بوڑھی دادی اپنے بیٹے کے پلنگ کے پاس بچھے ہوئے بوریے پر بیٹھی سلائی کی قمیص میں کھپاکھپ سوئیاں پھونک رہی تھی۔ پھر بھی عجیب سی ویرانی اور اداسی کھیلتے ہوئے بچوں سے لے کر سلائی کرتی ہوئی بڑھیا تک پر چھائی ہوئی تھی ——

جیتنے والا لڑکا مارے خوشی کے زور سے چیخا اور ہارنے والے کی گالیاں ایک دم خوفناک ہو گئیں۔ اس کا چہرہ کہہ رہا تھا۔ کہ وہ سخت ناراض ہے۔

"چپ رہو کتے کے پلو کان کھائے لیتے ہیں۔ سالے" باپ نے بیڑی کا ایک لمبا کش لگاتے ہوئے قہر بھری نظروں سے لڑکوں کی طرف دیکھا۔ مگر کتنے کے پلوں کے کان پر جوں بھی نہ رینگی اور پلوں کے باپ نے ایک بیڑی سے دوسری بیڑی سلگائی۔

سالے گالیاں بکتے ہیں — ان کی ماں —— یہ دنیا میں اور کیا کریں گے بس یونہی بہن —— گالیاں بکتے بکتے قبر میں سو جائیں گے — وہ آہستہ آہستہ بڑبڑانے لگا۔

"انہیں اسکول سے کیوں اٹھا لیا؟ اسی لئے نا کہ پڑھ لکھ کر انسان بن جائیں گے؟ وہ اپنی ماں کی طرف غصہ سے دیکھنے لگا۔

لے بس رہنے دے — وہ تو گالیاں بک رہے ہیں اور تو نے پھول

بکھیرے ہیں۔ بکنے دے، بیٹے تو ہیں۔ کب کے بھوکے ہیں بیچارے، جو آفت مچادی نا تو پتہ چلے گا۔ صبح کی ٹکڑا ٹکڑا روٹی کھائے ہوئے ہیں۔ اور اب ایک بج رہا ہوگا۔ وہ رہی دھوپ،" بڑھیا ماتا بھرے غصے سے بیٹے کو دیکھنے لگی۔

"ہاں —— بکنے دو گالیاں —— میں کہتا ہوں کیوں نہیں جاتے اسکول؟ اسی لئے کہ آنکھوں سے اوجھل نہ ہوں۔ ماتا پھٹتی ہے۔" وہ جاہل عورتوں کی طرح ہاتھ مٹکانے لگا۔

"ماتا نہیں پھٹتی، تیری جیب پھٹ گئی ہے" —— بڑھیا ایک دم تیز ہو گئی "بے پلے کوڑی، نام کا مفت اسکول ہے مگر مہینے میں دس خرچ بتائے جاتے ہیں۔ اور پھر کاپیاں قلم کہاں سے لاؤں؟" بڑھیا نے قمیص ایک طرف رکھ دی۔ اور ملامت بھری نظروں سے بیٹے کو دیکھنے لگی —— "ہیں —— خواہ مخواہ باتیں بناتا ہے بس"۔ وہ زیر لب بڑبڑائی اور وہ جیسے لاجواب سا ہو کر رہ گیا۔ لیکن اس کے چہرے پر سخت بیزاری چھلنے لگی۔ کچھ ایسی بیزاری کہ لگتا بس ایک ہی جست میں اپنی روح کو جسم کے پنجرے سے آزاد کرا کے آسمانوں سے آگے بھاگ جائے گا۔ اور اس دنیا میں ہرگز نہیں رہنا چاہتا جہاں چھٹانک چھٹانک بھر کے بچے سیر سیر بھر کی گالیاں بکیں اور کوئی انہیں تنبیہ نہ کر سکے اس لئے کہ وہ بھوکے ہیں۔ اور کوئی انہیں روٹی نہیں دے سکتا۔" مگر یہ گالیاں نہیں بکیں گے سالے" میں سر توڑ ڈالوں گا۔ اور —— اور —— وہ جاتے اور کہتا کہ بڑھیا بیچ میں بول اٹھی۔

"خدا کے لیئے اس وقت چپ رہ، تیرا کیا جائے گا، لڑکا باہر چلتا بنے گا۔

بس میں بہلاتی رہوں گی۔ اور یہ قمیض بھی پوری نہ ہو گی۔ تو پھر کنکر پتھر باندھ دوں گی ان کے پیٹ پر؟ بابا میں ہاتھ جوڑتی ہوں۔ پھر نصیحتیں کر لیجیو" ——— اور بڑھیا نے سچ مچ بیٹے کے آگے ہاتھ جوڑ دیئے۔ لڑکوں کے رونے اور کھانے کا مطالبہ کرنے کے خیال ہی سے اس کے چیونٹیاں کاٹنے لگیں۔ بیٹے نے ماں کو غصے اور بیزاری سے دیکھ کر اس کی طرف کروٹ بدل لی۔ اور بڑھیا نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے قمیض اٹھا لی۔ بلا آتے آتے ٹل گئی تھی ورنہ بیٹے کی حالت تو وہ خوب جانتی تھی۔ کہ کس قدر جھلا ہو گیا ہے۔ ریلوے کے مزدوروں کی چھانٹی میں کیا آیا کہ انسانیت کے دائرے سے ہی خارج ہو گیا۔ شروع شروع میں تو یہ تھا کہ دکھ درد کم نے کی فکر میں گھلا کرتا "کیا کرے اور کیا نہ کرے"۔ کے چکر میں پھنسا رہتا۔ پھر کچھ دن گزرے تو دکھ درد دور کرنے کی بجائے۔ ہر دم چڑچڑانا شروع کر دیا۔ ساتھ ہی بیڑیوں کی تعداد بڑھنے لگی۔ پھر اور دن بیتے تو ہر وقت گھر سے باہر رہنا شروع کر دیا؛ ایک ذرا دیر کو گھر آتا تو معلوم ہوتا کہ بھونچال آگیا ہے، یہ پیک وہ جھٹک، ایک بیڑی سے دوسری بیڑی سلگائی جا رہی ہے۔ اور دھوئیں کے ساتھ گالیاں بکی جا رہی ہیں ——— چھانٹی میں آنے سے پہلے بھی کچھ زیادہ سکھ سے نہ بسر ہو رہی تھی۔ پیٹ بھر گیا تو تن ننگا ہے اور اگر تن ڈھانکنے کی فکر کی گئی تو پیٹ ننگا ہو گیا۔ پھر بھی بچّوں سے محبت کا سلوک کرتا تھا۔ بیوی کو دن میں ایک آدھ بار مسکرا کر دیکھ لیتا تھا۔ اور ماں سے اس کا دکھ سکھ پوچھ لیتا تھا۔ اب تو گھر کا ہر فرد اس کا منہ تکا کرتا کہ شاید دو میٹھے بول بول دے ——— بڑھیا اس کی یہ حالت دیکھتی اور پکے پھوڑے کی طرح تپکا کرتی۔ بیٹے کا پریشان حال، فق چہرہ

اور آنکھوں میں ٹمٹماتا سا زندگی کا چراغ دیکھ کر وہ تڑپ تڑپ اٹھتی ۔ لاکھ جتن کر کے چار پیسے پیدا کرتی، صرف اس لیے کہ اس کے لال کی پریشانیوں میں کچھ تو کمی ہو ۔ مگر وہ دیکھ رہی تھی کہ پریشانیوں میں روز بروز زیادتی ہوتی جا رہی ہے بے حد بھوک میں روٹی کے دو نوالے پیٹ کی آگ کو گھٹانے کے بجائے بڑھا دیتے ہیں ۔ اور بڑھیا کی کوششیں اس کے آگے تھک کر بیٹھ جاتیں اس سے زیادہ وہ کچھ بھی نہ کر سکتی تھی ۔ اتنے ہی میں، اس کی بوڑھی ہڈیاں بری طرح کڑکڑا اٹھتیں ۔ اور جس وقت اسے اپنی تکلیفوں کا شدت سے احساس ہوتا تو وہ بھی بیٹے سے کچھ کم نہ جھلاتی ——— سب بھاڑ میں جائیں ! کمبختوں نے زندگی برباد کر رکھی ہے گھن کی طرح کھائے لیتے ہیں ۔" وہ آپ ہی آپ بڑبڑاتی، لیکن جس وقت بچوں کو بلکتے، بھوک سے چپکے چپکے روتے اور اپنے جگر کے ٹکڑے کو پریشان حال دیکھتی تو ٹریفک کے سپاہی کی طرح مستعد ہو کر اپنا کام کرنے لگتی ۔ اس وقت بھی وہ بڑی کاپھرتی سے قمیض سینے کی کوشش کر رہی تھی ۔ حالانکہ صبح سے ایک جگہ پر جھک کر بیٹھے بیٹھے اس کی ریڑھ کی ہڈی چٹخنے لگی تھی ۔ آنکھیں دکھ رہی تھیں ۔ اور انگلیوں میں اینٹھن ہو رہی تھی ۔ آنکھوں سے ویسے ہی کم سوجھتا ۔ جانے کس مشکل سے سلائی کرتی ۔

"ایما ——— ہیں ——— ایں ——— بھوک ———

کھیلتے کھیلتے چھوٹے لڑکے کو بھوک یاد آگئی ۔ اور بڑے نے بھی اس کا ساتھ دیا شی ——— شی ——— وہ" بڑھیا نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اشارے سے انہیں بتایا کہ چپ نہ رہے تو اٹھ کر تمہارا ابا پیٹ ڈالے گا ۔ بچوں نے ڈھٹائی

سے باپ کی طرف دیکھا اور پھر منہ بسورنے لگے۔

"ہم نہیں جانتے ہمیں کھانا دو" وہ منمنائے۔

"بس ابھی چٹ پٹ روٹی پکاتی ہوں۔ جب تک تم باہر کھیل آؤ۔ کیسے اچھے میرے لال، آج گڑ لاؤں گی" بڑھیا نے انہیں بہلایا۔

"ہم نہیں جانتے، ایں۔ ہمیں روٹی دو" چھوٹا لڑکا رونے کی تیاری کرنے لگا"

"نکلو گھر سے ـــــــ" بیڑی کا آخری کش لے کر وہ ہنکارا "بھوک لگی ہے سالے نہیں تو۔ اپنے حصے کی روٹی لے کر تو دنیا میں آئے نہیں اور بھوک لگی ہے وہ لال لال آنکھیں نکال کر بچوں کو گھورنے لگا۔ بڑھیا نے تلملا کر قمیض رکھ دی۔ بلا پھر نازل ہو رہی تھی۔

"چلو باہر نہیں تو ہڈی پسلی ایک کر دوں گا ہاں ـــــــ" وہ لیٹے سے اٹھ بیٹھا۔ بڑھیا اپنی جگہ پر کھڑی ہو گئی۔ بچوں نے سہمی سہمی نظروں سے باپ کی طرف دیکھا۔ اور گولیاں اٹھا کر باہر نکل گئے۔ وہ بیڑی سلگا کر پھر لیٹ گیا بڑھیا نے قمیض اٹھائی۔ اب وہ اور بھی تیزی سے سینے کی کوشش کر رہی تھی۔ جیب گلا اور کاج بٹن باقی تھے۔ کاج جو اسے سب سے زیادہ مشکل لگتے۔ ایک تو ویسے ہی کم دکھائی دیتا۔ اوپر سے باریک ترین کام۔ لیکن بڑھیا کے نزدیک یہ باریک ترین کام اس وقت کوئی حقیقت نہ رکھتا تھا۔ اس وقت سب بھوک سے بلبلا رہے تھے۔ اور ان کے لیے پہاڑ بھی کھود سکتی تھی۔

گلے پر بخیہ کرتے ہوئے اس نے بیٹے کی طرف دیکھا۔ وہ جانے کس گھڑی

فکر میں ڈوبا ہوا تھا۔ کھویا کھویا، بیحد اداس، مگر بڑھیا کو وہ صرف بہو کا نظر آیا۔
اس کی ممتا بُری طرح پھڑکنے لگی۔ اور اس نے بہو کو دیکھا۔ کہ ذرا ہاتھ بٹائے
تو منٹوں میں کام ختم ہو جائے۔ لیکن بہو تو آج صبح سے بے حد خاموش اور نڈھال ہو
رہی تھی۔ اس وقت بھی وہ دیوار کا سہارا لیے یوں بیٹھی اونگھ رہی تھی۔ جیسے افیون
کی ایک گولی چڑھا لی ہو۔ بڑھیا کو اس پر بھی رحم آنے لگا ———— غریب کیا
ہاتھ بٹائے گی ———— جوان جہان جسم تو ہر وقت کچھ نہ کچھ کھانے کو مانگتا
رہتا ہے۔ لیکن یہاں تو خالی پیٹ اور پر سے ستم یہ کہ چوبیس گھنٹے بچے کو خون
چساتے۔ نڈھال نہ ہو تو کیا ہو۔ کمبخت بدنصیب ہے، ایک دو ہوں پورے تین
بچے اسی مصیبت میں پال چکی ہے۔ کوئی حد ہوتی ہے دکھوں کی ـــ زیادہ تنگ
آگئی تو جانے کیا کچھ کر بیٹھے ———— اور اس خیال کے ساتھ اسے وہ بات
یاد آگئی جب بہو کے پیٹ میں پہلا بچہ تھا۔ تو وہ ہر وقت کھٹی میٹھی چیزوں کے
لیئے للیایا کرتی۔ سودے والوں کی آوازوں پر چونک چونک پڑتی تھی اور ایک
دن اس نے بہو کی اس حرکت پر جل کر اسے گالیاں دیں تھیں۔ کہ شاہزادی صاحبہ
کے شوہر تو نہ جانے کس طرح گھر کا خرچ چلاتے ہیں اور صاحبہ ہیں کہ آنکھوں پر ٹھیکری
رکھ کر بس زبان کا چٹخارہ چاہتی ہیں۔ اس کے بعد بہو نے پھر کسی چیز کی فرمائش نہ
کی تھی۔ وہ خوش ہوئی تھی کہ چلو بہو کی فرمائشوں سے نجات ملی۔ لیکن جب ایک
دن اس نے دیکھا کہ دروازے پر کھڑی سامنے کے حلوائی کو مسکرا مسکرا کر دیکھ
رہی ہے تو اس کی بوڑھی جان جیسے سن ہو کر رہ گئی تھی۔ بہو نے تو قسمیں کھا کھا کر اسے
لاکھ یقین دلایا کہ وہ گلی میں کھیلتے ہوئے بچوں کی شرارت پر ہنس رہی تھی لیکن

وہ نہ مانی، کوئی وہ بھی دودھ پیتا بچہ تھی۔ جو نظر بھی نہ پہچانتی۔ ارے وہ لاکھ بوڑھی اَدھی
اور اندھی سہی مگر اڑتی چڑیا کے پر گن سکتی تھی۔

سوئی روک کر اس نے ایک بار پھر بہو کی طرف دیکھا لیکن اس دفعہ تو نہ وہ
اسے بھوکی نظر آئی اور نہ نڈھال، بس کچھ کر گزرنے والی معلوم ہو رہی تھی۔ بڑھیا کا
دل کچھ اس طرح کانپ اٹھا۔ جیسے مرغی کا ننھا سا بچہ چیل کے پروں کے سناٹے
سے لرز کر رہ جائے۔ لے دے کے اس کے پاس ایک عزت ہی تو رہ گئی تھی۔
جسے کلیجے سے لگا کر خوش ہو لیتی۔ اس کا بیٹا افسروں کی بے جا جھڑکیاں سنتا رہا
مگر اس کی عزت میں کبھی فرق نہ آیا۔ وہ مزدوروں کی چھانٹی میں آگیا۔ اور وہ اپنی
بے عزتی محسوس نہ کر سکی۔ وہ کمر توڑ توڑ کر سلائی کرتی۔ اور جب معاوضہ طلب کرتی۔
تو ایک آدھ جھڑکی سے معاوضے کی کمی کو پورا کر دیا جاتا۔ لیکن وہ پھر بھی باعزت
تھی، اس کے ہاں عزت تو صرف اسی صورت میں جا سکتی تھی۔ جب کسی کی بہو یا بیٹی
ادھر ادھر آنکھ لڑا بیٹھے اور بہو کی طرف سے اسے پورا پورا خطرہ تھا۔ زیادہ
مار پڑے تو انسان تو یہ بھول جاتا ہے۔ مگر وہ نہیں سوچ سکتی تھی۔ کہ اس کی بہو بھی
تو یہ بھول جائے، ملوائی کے قصے کے بعد سے تو وہ اس کی ایسی کڑی نگرانی کرتی
جیسے بہو قاتل ہو، اس کے باوجود بڑھیا خوفزدہ رہتی۔ وہ جانتی تھی۔ کہ سارے
دروازے بند کر لینے سے چور کا خطرہ دور نہیں ہو جایا کرتا۔ سینڈ بھی لگ جاتی ہے
جو یہاں سے وہاں تک صفایا کر دے۔ وہ تنہا کوڑی کوڑی پہ تیرے میرے
کام کرتی پھرتی مگر بہو کو ساتھ نہ لے جاتی۔ جوانی اور اچھی خاصی صورت سونے
پر سہاگے کا کام دیتی، بڑھیا کھٹکتی اس کی صورت سے حالانکہ وہ خود ہی بہو کو چار

آنے کے گھڑے کی طرح خوب دیکھ بھال کر لائی تھی۔ کہ کہیں اس کے بیٹے کا جی برا نہ ہو اور اب وہ صورت ایسی کھلتی کہ اس کا جی چاہتا کہ اس طرح بگاڑ دے کہ یہ کھڑا کھڑا ناک نقشہ غائب ہو جائے۔ بس کھنڈر ہی کھنڈر رہ جائیں۔

اس نے آنکھوں سے بہتے ہوئے پانی کو ہتھیلیوں سے پونچھ کر جلتی جلتی نظروں سے بہو کو دیکھا جو اسی طرح چپ چاپ بیٹھی اونگھ رہی تھی —— محلوں کے خواب دیکھ رہی ہوگی —— بڑھیا آپ ہی آپ کڑھی —— کچھ کام کاج کرتی رہے تو دھیان بٹا رہے مگر اس کے لیے تو بہانہ ہے کہ پیٹ بھر روٹی نہیں ملتی، چکر آتے ہیں۔ اوپر سے بھوکے پیٹ بچے کو دودھ پلاتی ہے۔ اسی لیے ہلا نہیں جاتا —— کمبخت مکار، وہ خوب سمجھتی ہے یہ سارے گن ترانت کی آدھی روٹی نہیں بھاتی۔ جبھی یہ ہاتھ پاؤں ڈھیلے کر دیئے ہیں۔ چپکی گھنی بنی بیٹھی رہتی ہے۔ دیکھنے والے کہتے ہیں۔ کہ بہو تو اللہ میاں کی گائے ہے۔ مگر وہ خوب جانتی ہے۔ اس گائے کو، گلا کاٹ ڈالے اور ہلائے نہ کرے۔ اور —— " آگے وہ کچھ نہ سوچ سکی۔ بہو کے خلاف کام کرنے والے جذبے نے اس کے دماغ میں شعلے سے بھڑکا دیئے تھے۔

" شہزادیوں کی طرح آرام کرتی رہتی ہے۔ یہ نہیں ہوتا کہ ذرا ہاتھ بٹالے"
—— اب صرف بٹن ٹانکنے کو رہ گئے تھے۔ پھر بھی قمیض ٹیک کر چیخی —— " حرام کھانے کی عادت ہو گئی ہے۔ جانتی ہے نا کہ بڑھیا اپنی ہڈیاں پیل کر ٹھونسنے بھرنے کا سامان کر ہی دے گی۔ پھر اپنے آرام میں کیوں خلل آئے اور پھر وہ بڑبڑانے لگی۔" ایسے سبز قدم آئے کہ جھاڑو پھر گئی بٹ کر رہ گیا سب

کچھ ــــــ" بہو نے بجھی بجھی نظروں سے بڑھیا کو دیکھا اور پھر سر جھکا دیا۔ اس کی آنکھوں میں امنڈتے ہوئے آنسو بچے کی میلی قمیض دھوتے لگے اور بڑھیا کا غصہ رفو چکر ہونے لگا۔ وہ تو کچھ ایسی طبیعت کی تھی۔ کہ اپنے دشمن کو بھی روتا نہ دیکھ سکتی تھی۔ پھر بہو نے تو اس کی بڑی خدمت کی تھی۔ ساتھ ہی اس کی جھڑکیاں بھی برداشت کی تھیں۔ مگر پلٹ کر آدھی بات نہ کہی تھی۔ اس نے چپکے سے قمیض اٹھا لی۔

"تو کام کیوں نہیں کرتی لاٹ صاحب کی بچی ــــــ کیوں نہیں کرتی کام! انکلیوں میں گم ہوتا ہوا بیڑی کا ٹکڑا پھینک کر چیخا ــــــ بڑھیا ڈر ی کہ اب پھر آفت ہو گی۔ مگر چپ رہی کہ چڑیل کو ایک ذرا دھمکا لے تو اچھا ہی ہے، ٹین ٹانکتی رہی اس نے دیکھا ہی نہیں۔ کہ بہو کی آنکھوں میں بھی جوابی حملے کی طاقت کلبلا رہی ہے۔

مجھے گھورتی ہے۔ ایں، مجھے گھورتی ہے، تیری ــــــ" اور آدھی گالی چھپاتے سے اٹھنے کی طاقت لے چھٹی۔ بڑھیا لڑکھڑا کر اٹھی مگر جب تک وہ بہو کے قریب پہنچے پہنچے بیٹا بہو کی ہڈیوں کی مضبوطی کا اندازہ لگا چکا تھا۔ بڑھیا نے بڑی مشکل سے اسے دھکے دے دے کر پھر پلنگ تک پہنچایا۔ اس کوشش میں اس کی سانس دھونکنی کی طرح چلنے لگی تھی۔ بہو ہولے ہولے رو رہی تھی۔

"ہاتھ ٹوٹیں نہ کھلانے کا نہ پہناتے کا۔ ے کے بہو کی جان کو پیٹ ڈالا! کام نہیں کرتی تو کیا۔ بس کوئی بات ہو تو بیچ میں پھٹ پڑے گا۔ بس دماغ چل گیا ہے۔" بڑھیا نے اسی بہو کی حمایت میں بیٹے کو برا بھلا کہہ ڈالا جو ذرا دیر پہلے

ناک کاٹنے کا استرا نظر آ رہی تھی۔

"کبھی تیرے باپ نے بھی مجھ پر ہاتھ نہیں اٹھایا۔ ایک تو ہے نالائق بڑھیا نے آگے بڑھ کر بہو کو سینے سے لگا لیا۔ تو شائد ہمدردی کی وجہ سے اس کے رونے کی آواز تیز ہو گئی۔ اور ایسی دردناک آواز کہ بڑھیا کا کلیجہ مسلنے لگا

"باپ چھانٹی میں بھی تو نہیں آیا تھا، کچھ تو کما کر تمہیں دیتا تھا:" اس کے لہجے میں کچھ نہ کر سکنے کی بے بسی اور کچھ کر گذرنے کا اضطراب کروٹیں لے رہا تھا۔ اس نے بیڑی کا ایک لمبا کش لے کر طویل آہ بھری۔

"کچھ نہیں دیتا تو کیا ہوا۔ اللہ وہ دن لائے کہ دے گا بھی، پر بورہا پن کس کام کا:" بڑھیا نے محبت سے بیٹے کو دیکھا۔ اور اس نے تیوریوں پر بل ڈال کر اس طرف کروٹ لے لی۔ جیسے اسے ماں کی بات ایک آنکھ نہ بھائی ہو۔ لیکن بڑھیا نے بیٹے کی یہ حرکت نہ دیکھی: وہ بہو کو کلیجے سے لگائے اسے چپ کرانے میں لگی ہوئی تھی۔ رونے کی آواز آہستہ آہستہ کم ہوتے ہوتے ہچکیوں اور پھر سسکیوں میں تبدیل ہو کر دبی دبی آہ بن گئی۔ بڑھیا نے مطمئن ہو کر اٹھی اور قمیص کے باقی بٹن ٹانکنے لگی، مگر دو تین بٹن ٹانکنا اسے ایسے مشکل لگ رہے تھے کہ توبہ۔ اس کا جی چاہ رہا تھا۔ کہ بس ایک ہی ٹانکے میں بٹن لگ جائے اور دم کے دم میں سلائی کا روپیہ لے کر سودا خرید لائے۔ اس وقت تو سب کو خوب پیٹ بھر بھر کر کھلا ہی دے خاص کر بہو کو، لاکھ وہ چپ ہو بیٹھی تھی۔ مگر بڑھیا کو اس کے دکھ کا پورا احساس تھا۔

قمیص تیار ہو گئی تو وہ ہاتھوں سے استری کر کے تہ کرنے لگی۔ قمیص تیار کر

کے وہ بچوں کی طرح خوش ہو رہی تھی۔

"تو جب تک آگ سلگالے" اس نے پیار سے بہو کی طرف دیکھا ــــــ

"میں بس ابھی سودا لے کر آئی۔ لیکن تو ــــــ یہ تو کہاں چلا! بیٹے کو جوتے پہنتے دیکھ کر اس کی خوشی دم توڑنے لگی۔

"جلسے میں جانا ہے۔" وہ اکھڑپن سے جواب دے کر کھڑا ہو گیا۔

"جلسے، بس جب دیکھو جلسے، میں تو ابھی نہ جانے دوں گی۔ کب کا بھوکا ہے اک ذرا میں سودا لائی۔ اور چٹ پٹ روٹی پک جائے گی۔" بڑھیا اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر بٹھانے لگی۔

"میں نہیں رک سکتا۔ مجھے ابھی جانا ہے۔" اس نے ہاتھ کو جھٹک دیا۔

"مجھے جانا ہے ــــــ یہ جلسے تجھے کیا دیتے ہیں۔ جو دوڑ دوڑ کر جایا کرتا ہے" ــــــ وہ پیار بھرے غصے سے چلائی "آٹھ دس سیر آٹا باندھ لایا کر وہاں سے تو میں جانوں بھی ــــــ ہاں میں نہیں جانے دوں گی۔ چپکے سے بیٹھ" اس نے بیٹے کی بانہہ پکڑ لی۔ اور وہ کھسیانی ہنسی ہنس پڑا۔

"تم کیا جانو، مجھے بڑا ضروری کام ہے۔" وہ بانہہ چھڑانے لگا۔

"ہاں! میں کیا جانوں، مجھے سب پتہ ہے۔ پیارے کی ماں کہتی تھی کہ یہ سب بڑے آدمیوں کے تماشے ہیں۔ رنڈی نہ نچائی۔ ننگے بھوکے مزدوروں کو نچا لیا۔ اور خود اپنے لیے تالیاں بجوائیں۔ ہار پہنے، پھر آرام سے گھر کی راہ لی روتی ہے۔ اس کی ماں بھی۔ جب دیکھو ہڑتال ہے۔ اور گھر میں فاقے پر فاقے ہیں تو کہتی ہوں کہ ــــــ

"بس چپ بھی رہو، نہ جانو نہ بوجھو اور لگادی بیں بیں" ۔ وہ بات کاٹ کر بڑے زور سے چڑچڑایا۔

بڑھیا خوشامد پہ اتر آئی "بیٹا تو تو ناحق غصہ کرتا ہے، یہ بھی تو سوچ کہ سارا گھر تیرے سر ہے، مارے یا جلائے۔ چھانٹی میں آگیا ہے۔ تو کوئی دردسری نوکری کرے کون سے یہ جلسے تجھے وزیر بنا دیں گے! تیرے باپ دادا سبھی نوکری کرتے تھے، ملوں میں، ریلوائی میں تو جلسوں میں نوکری بجاتا پھرتا ہے"۔

"ہیں، باپ دادا"۔ وہ ایک دم تیز ہو گیا "سالوں نے ساری زندگی پیٹ بھر محنت کی۔ اور آدھے پیٹ روٹی کھائی۔ کوئی دنیا سے جاتے ہوئے خالی ہاتھ ہوتا ہے، وہ زندگی بھر مردے بنے رہے، مگر اُف نہ کی، مر جاؤ بھوکے مگر مجھ سے ایسی نوکری نہیں ہونے کی، میں باپ دادا نہیں ہوں، سمجھیں، ہاں" ——— وہ پاؤں پٹختا زن سے باہر نکل گیا۔ جانے کیوں بدھو کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا رہے تھے۔ کھسیائی سی بڑھیا الگنی پر پڑی ہوئی چادر اٹھا کر اوڑھنے لگی، اسے بیٹے پر سخت غصہ آرہا تھا۔

"ہے لاٹ صاحب، دیکھیں گے پھر کونسی نوکری کرتا ہے۔ جب سپے بوٹیاں نوچیں گے۔ اور جورو کسی سے آنکھ لگا کر نکل بھاگے گی، ابھی تو مجھ بوڑھی پر خوب اترالے" ——— وہ جاتے ہوئے راستہ بھر بڑبڑاتی رہی۔ پھر قمیص دے کر سودا خریدتی ہوئی گھر واپس لوٹی تو غصے کا پتہ بھی نہ تھا۔ بہو آگ جلائے چپ چاپ بیٹھی تھی۔ لکڑیوں سے نکلتا ہوا دھواں ننھی سیاہ سپنولیوں

کی طرح بل کھاتا چھوٹی سی کوٹھڑی میں بے چین ہو رہا تھا۔ کوٹھڑی کے باہر کی اونگھتی سی فضا میں جیسے بین بج رہی تھی۔ اور بچے آگ کو دیکھ دیکھ کر خوشی سے پھولے نہ سمارہے تھے۔ بڑھیا نے آٹے کی پوٹلی رکھ کر ایک لمحے تک بچوں کے خوش ہونے کا منظر دیکھا۔ اور دوسرے ہی لمحے وہ آٹا مسل مسل کر روٹی بنانے لگی۔ بہو نے لاکھ منع کیا کہ وہ خود روٹی پکالے گی۔ مگر بڑھیا نہ مانی آج تو اس کا جی چاہ رہا تھا۔ کہ بڑے پیار سے بہو کو روٹی پکا کر دے۔ جب سے اس پر مار پڑی تھی۔ بڑھیا کو رہ رہ کر اس کی محبت ستا رہی تھی۔

سب کو کھلا پلا کر جب وہ اپنے حصے کی ایک موٹی سی روٹی لے کر کھانے بیٹھی تو اسے بیٹے کی بھوک یاد آگئی۔ پہلا ہی نوالہ حلق میں پھنسنے لگا۔ اسے خیال آرہا تھا۔ کہ جب بیٹا آئے گا۔ تو روٹی ٹھنڈی برف ہو چکی ہوگی۔ باجرے کی ٹھنڈی روٹی تو بس ایسی لگتی ہے۔ جیسے ریت پھانک رہے ہوں۔ خاک حلق سے اترے گی۔ پر کون جانے کہ رات کو کب لوٹے کمبخت بھوکا پیاسا کہاں کہاں پھر رہا ہوگا۔ اور پھر اچانک اسے یاد آیا۔ کہ قریب ہی کے پارک میں تو جلسہ ہے۔ کل جب وہ قمیض لینے جا رہی تھی۔ تو اس نے دیکھا تھا کہ اسکا بیٹا تانگے پر بیٹھا منہ میں بھونپو سی تو کہہ رہا تھا۔ کہ اسی پارک میں جلسہ ہوگا چار قدم پر تو ہے۔ کیوں نہ گرم گرم روٹی دے ہی آئے —— اور اس خیال کے ساتھ ہی بڑھیا نے جلدی جلدی الٹے سیدھے نوالے نگل لیے پھر چولہے پر رکھی ہوئی گرم گرم روٹی پر گڑ کی چٹنی رکھ کر جھاڑن میں باندھ لی۔

"تیرے آدمی کو بھی روٹی دے آؤں، این نا؟ کیسا بھوکا ہوگا۔ روٹی ٹھنڈی ہو گئی تو مٹی ہو جائے گی۔ گرم گرم کھائے گا۔" وہ بہو کو دیکھ کر مسکرائی "بس ابھی آئی چٹ پٹ، تو جب تک بچوں کو سلا دے۔" اس نے چادر اوڑھ کر روٹی کی ننھی سی پوٹلی بغل میں داب لی۔ اور پھر تیزی سے باہر نکل گئی روٹی ٹھنڈی ہو جانے کے خیال سے اس کے قدم ایسے تیز اٹھ رہے تھے جیسے ہوا میں اڑ رہی تھی۔

شام ہو چکی تھی، سڑک پر عجیب گہما گہمی تھی۔ رنگین لباسوں میں تھرکتی سی لڑکیاں بجلی کی روشنی میں کوندتی پھر رہی تھی۔ سیاہ برقعے تاریک سایوں کی طرح رینگ رہے تھے۔ خوبصورت کاریں بغیر شور مچائے یوں دوڑتی پھر رہی تھیں۔ جیسے پانی میں تیر رہی ہوں، تانگے پہیوں میں ایک طوفانی شور سمیٹے تھے۔ اور سائیکلوں کی گھنٹیاں جیسے جل ترنگ بجا رہی تھیں۔ لیکن بڑھیا کو یہ گہما گہمی پیروں کی بیڑیاں لگ رہی تھیں۔ بار بار اس کے قدم رک جاتے۔ گھبرا کر روٹی کو سینے کے پاس دبا کر گرمی کا اندازہ لگانے لگتی۔ پھر جب راستہ صاف ہوتا تو تیزی سے چلنے لگتی ۔

پارک پہنچی تو دوسری مشکل سامنے کھڑی تھی۔ سینکڑوں مزدور گھاس پر بکھرے ہوئے تھے۔ اور ان میں اپنے بیٹے کو تلاش کر لینا اسے ناممکن معلوم ہونے لگا۔ پھر بھی وہ ذرا مجمع سے ہٹ کر بجلی کے کھمبے کے پاس کھڑی ہو گئی جہاں کوئی شخص کھڑا اخبار پڑھ رہا تھا۔ وہ وہیں سے کھڑے کھڑے نظریں دوڑانے لگی۔ مگر وہاں تو صرف سر ہی سر نظر آ رہے تھے۔ یا پھر پارک کے وسط میں پڑی ہوئی۔ بڑی سی چوکی اس پر بچھی ہوئی سفید چادر، گیس کی بڑی سی لالٹین اور لاؤڈ اسپیکر

صورتیں تو اچھی طرح دکھائی بھی نہ دیتیں ۔ وہ دیر تک ایڑیاں اُچکا اُچکا کر اور آنکھوں سے بہتے ہوئے پانی کو پونچھ پونچھ کر اپنی ساری بصارت خرچ کرتی رہی مگر اسے اپنا بیٹا کہیں نظر نہ آیا ۔ وہ بے چین ہونے لگی ۔ کہ اب کرے تو کیا؟ اس نے اخبار پڑھتے ہوئے آدمی کی طرف دیکھا کہ اس سے پوچھے مگر ہمت نہ پڑی ' آدمی سوٹ پہنے تھا اور اخبار پڑھ رہا تھا' وہ رعب کھا رہی تھی ' کمبل اوڑھے ہوئے ایک شخص اس کے پاس سے گزرنے لگا ۔ تو وہ جلدی سے پوچھ بیٹھی ۔

"کیا بیٹا دین محمد ہو گا یہاں"؟

"کون دین محمد؟ میں تو نہیں جانتا مائی" اور آدمی آگے بڑھ کر مزدوروں کے جھنڈ میں غائب ہو گیا ۔

"کسے پوچھ رہی ہو مائی"؟ اخبار کا صفحہ الٹ کر آدمی اس سے مخاطب ہو گیا

"میرا بیٹا دین محمد' وہ جو تانگے پر بھونپو لگائے جلسے کے لیے پکارتا پھرتا ہے' وہی" بڑھیا نے اپنے بیٹے کے لیئے اچھی طرح بتا دیا تاکہ وہ سمجھ جائے ۔ بھلا جلسے میں آنے والے اس کے بیٹے کو نہ جانتے ہوں گے ۔

"میں تو اسے نہیں جانتا مائی" آدمی نے مسکرا کر بڑے مہربان لہجے میں جواب دیا ۔ اور پھر اخبار پر نظریں جما دیں ۔ بڑھیا کو بڑا بُرا سا لگا کہ کوئی اسے جانتا ہی نہیں ۔ اور وہ کمبخت ہے کہ بھونپو منہ میں لگائے سارا سارا دن گلا پھاڑتا پھرتا ہے ۔

"ہاں اسے کوئی نہیں جانتا اور جلسے میں اتنے بہت سے آدمی یوں ہی آ جاتے ہیں" اس نے مجمع کے سامنے اشارہ کر کے لمبی سانس بھری ۔

ان جلسوں کے پیچھے مٹی خراب کر دی ہے۔ بیوی بچوں کی اور کوئی نہیں جانتا وہ رنجیدہ ہو رہی تھی۔

"اوہ!" آدمی ایسے پیار سے مسکرایا جیسے کسی ننھے بچے کو کلکاریاں مارتے دیکھ رہا ہو ـــ میں اب اس کا نام پوچھوں گا، اس سے ملوں گا سب کو بتاؤں کا بھی کہ وہ کون ہے۔ اچھا مائی" وہ اس طرح بولا جیسے بچے کو کھلونوں سے بہلا رہا ہو۔ بڑھیا نے ممنون ہو کر سر جھکا دیا۔ کیسا اچھا آدمی ہے۔

"کیا کرتا ہے تمہارا بیٹا؟" آدمی نے سوال کیا۔

پہلے ریلوائی میں کام کرتا تھا، پھر چھانٹی میں آگیا۔ اور اب بیٹا، وہ جلسوں میں مارا مارا پھرتا ہے۔ نہ کوئی نوکری نہ چاکری، روز فاقے ہوتے ہیں۔ لاکھ کہو دوسری نوکری کر لے۔ مگر نہیں سنتا۔ کہتا ہے کہ جس نوکری میں آدھے پیٹ روٹی ملے وہ نہیں چاہیئے۔ اب نہ آدھے پیٹ ہے نہ پورے۔ یہ کون سمجھائے۔ ان جلسوں نے خراب کر دیا ہے اسے۔" اسے اچھا آدمی سمجھ کر بڑھیا نے اپنی بپتا کہہ ڈالی۔

"مگر مائی یہ جلسے خراب نہیں کرتے۔ یہی ایک دن تمہارے بیٹے کو پیٹ بھر روٹی دلائیں گے"۔ وہ بڑھیا کو بچوں کی طرح سمجھانے لگا۔ "اور پھر ایک دن" ــــ

ارے بیٹا تم بھی میرے بیٹے جیسی بات کہتے ہو۔ یہ دیکھو میرا سر سفید ہو گیا یہ سنتے سنتے ــــ بڑھیا بیزار ہو رہی تھی" میں کہتی ہوں کہ یہ سب تماشے کی باتیں ہیں۔ بڑے آدمیوں کے کھیل، بیٹیا رنڈی نہ نچانی مزدور کا جلسہ

کہ دیا۔ تم کیا جانو بچے ہو، میرے بیٹے کے برابر۔" اس نے بڑی رازدارانہ نظروں سے آدمی کی طرف دیکھا۔

"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے مائی" آدمی زور سے ہنس پڑا اور ایسی میٹھی میٹھی نظروں سے بڑھیا کو دیکھنے لگا جیسے کسی پیارے سے بچے نے بڑی معصوم غلطی کی ہو۔

تمہارا بیٹا مجھے ملا تو اسے خوب سمجھاؤں گا، اچھا" آدمی نے اسے تسلی دی اور پھر اشتہار دیکھنے لگا۔ ادھر اس نے روٹی کی پوٹلی ٹٹولی تو ٹھنڈی ہو رہی تھی۔ اسے بڑا دکھ ہوا کہ اس کا جاگ کر آنا بیکار گیا۔ پھر بھی وہ کھڑی رہی کہ شاید بیٹا کہیں نظر ہی آجائے۔ کچھ نہیں تو ٹھنڈی روٹی ہی سے پیٹ بھر لے گا۔ ورنہ کون جانے کہ رات کو کس وقت تک گھر لوٹے بھوک سے آنتیں سوکھ کر رہ جائیں گی۔ مجمع پر دو چار نظریں ڈالنے کے بعد وہ اخبار کے الٹے ہوئے صفحے کی تصویریں دیکھنے لگی۔ ایک کمزور مرجھلی سی عورت جو لہنگا پہنے زمین پر بیٹھی تھی۔ دوسری تندرست خوبصورت عورت جس کے کپڑے پھولدار تھے۔ وہ بڑے پیار سے مسکرا رہی تھی۔ اس کے سر پر پھولوں کا تاج سا بنا ہوا تھا۔ بڑھیا کو وہ عورت بڑی پیاری لگی۔ جانے کون ہو گی؟ وہ سوچنے لگی شہزادی ہو گی کوئی۔ مگر پھر اسے خیال آیا کہ کہانیوں میں تو اس نے سنا تھا کہ شہزادیاں سونے کا تاج لگاتی ہیں۔ مگر یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ فوٹو کھچوانے کے لیے اس نے پھولوں کا تاج لگا لیا ہو۔

"کیوں بیٹا! یہ کسی شہزادی کی تصویر ہے؟" بڑھیا نے اپنے اطمینان کے

لئے پوچھا۔

"شہزادی!" وہ زور سے ہنسا۔ "یہ تو ایک مزدور عورت کی تصویر ہے۔"

بڑھیا حیران رہ گئی اسے بڑا برا سا خیال آیا کہ یہ ضرور کوئی چھٹی ہوئی ہرجائی عورت ہوگی۔ "پر بیٹا ہم نے تو ایسی مزدور عورت کو کبھی نہیں دیکھا۔ جو بالوں میں پھول لگائے ایسے کپڑے پہنے اور اپنا فوٹو اخباروں میں دے۔ "توبہ توبہ" بڑھیا کا ایک ہاتھ کان کی طرف اٹھ گیا۔

ارے مائی۔" آدمی سمجھانے کے لہجے میں کہنے لگا "یہ یہاں کی نہیں ہے، ایک ملک ہے چین یہ وہاں کی مزدور عورت ہے۔ تمہارے ملک کی تو یہ رہی" اس نے لہنگے والی مرجھلی عورت کی طرف اشارہ کیا۔ "وہاں کے مزدور بڑی اچھی زندگی بسر کرتے ہیں۔ وہ اچھا کھاتے ہیں اچھا پہنتے ہیں۔ پہلے یہ بھی دوسری عورت کی طرح مر مر کے جیتے تھے۔ مگر پھر انہوں نے اچھی طرح جینے اور زندہ رہنے کی کوشش کی" اور ـــــــ

بڑھیا نے اس کی بات کاٹ دی۔ "بیٹا وہاں مرد عورت سب ایسے ہی ٹھاٹ سے رہتے ہیں؟" اسے یقین نہ آرہا تھا۔ اس کے لئے تو یہ باتیں کھل جا سم سم سے کچھ کم حیرتناک نہ تھیں۔

"ہاں ہاں! سب، وہ محنت کرتے ہیں تو انہیں اس کا معاوضہ ملتا ہے کہ خوب آرام سے زندگی گزاریں اور اگر تمہیں یقین نہ آئے تو کسی اور سے پوچھ لو کہ چین میں مزدور کیسے زندگی گزارتے ہیں اور ـــــ وہ چپ ہو گیا۔ بڑھیا چین کی عجیب و غریب زندگی پر دل ہی دل میں رشک کرتے ہوئے اپنی

تباہ حالی کے بارے میں سوچ رہی تھی کہ ایک دم اسے خیال آیا کیوں نہ وہ بھی وہاں چلی جائے۔ اور اس خیال کے ساتھ ہی وہ سچ مچ تصویر کے چور دروازے سے چین پہنچ گئی۔ جہاں اس کا اچھا خاصا گھر ہے۔ اس کا بیٹا صاحب بہادروں جیسے کپڑے پہنے کام پر سے واپس ہوا ہے۔ خوش اور تندرست ہے۔ بات بات پر مسکرا رہا ہے۔ بچوں کو پیار کر رہا ہے۔ بیوی کو محبت سے دیکھ رہا ہے۔ بیوی پھولدار کپڑے پہنے ہے۔ اس کے بالوں میں پھول سجے ہیں۔ بچوں کو اس نے ایک ایک گلاس دودھ پلایا ہے۔ کیونکہ وہ باہر گیند بلا کھیلنے جا رہے ہیں۔ بہو کھانا پکانے کے انتظام میں مصروف ہے۔ بھنے ہوئے گوشت کی خوشبو اڑ رہی ہے۔ باریک باریک چپاتیوں کا آٹا گوندھا جا رہا ہے۔ اور خود وہ چوکی پر بیٹھی ہے وہ جو سارے گھر کی مالک ہے، اس کے کمر بند میں چابیوں کا بڑا سا گچھا بندھا ہے اور ـــ تالیوں اور زندہ باد کے شور نے اسے پھر وہیں گھسیٹ بلایا جہاں وہ تھی۔ جہاں سینکڑوں ننگے بھوکے مزدور تھے۔ اور وہ آدمی جلدی اخبار تہ کر رہا تھا۔ پھر جیسے ہی اس نے جانے کے لئے قدم اٹھایا بڑھیا نے جلدی سے سوال کر دیا۔

"کیوں بیٹا! کیا نام ہے وہاں کا جہاں کے مزدور" بڑھیا نام بھول رہی تھی۔

"چین! ـــ آدمی الوداعی نظر ڈال کر پیار سے مسکرایا اور آگے بڑھ گیا۔

"اے بیٹے۔ وہاں کا کرایہ کتنا ہوگا؟" بڑھیا اس کے پیچھے لپکتے ہوئے چیخ پڑی۔

ایک خط

"ہاں لکھو بھیا" کلو نائی کی بیوی نے حکم لگایا۔

"ہوں!" اس نے مری سی آواز میں ہوں کی اور تخت پر پڑی ہوئی موٹی سی انگریزی کی کتاب کو دیکھ کر قلم اٹھا لیا۔ ابھی ذرا دیر پہلے وہ کیسے مزے میں اپنی بیٹھک میں تنہا پڑا "ہندوستانی ادب میں رکھا ہی کیا ہے" کے ــــــ خیال کو دماغ میں ابھارے مغربی ادب کو جانچ رہا تھا۔ اور اب یہ آگئی نہ جانے کہاں سے، بھری دوپہر میں پریشان کرنے۔

"سلام لکھوں یا دعا؟" اس نے پوچھا۔

"ہے تو بڑا بھائی۔ پر بھیا تم کچھ نہ لکھو اور ــــــ دمے کی بلغمی کھانسی آندھی کی طرح اٹھی اور وہ اپنے منہ میں اوڑھنی کا آنچل ٹھونس کر ساری جان سے

کانپ گئی۔ چہرہ بیر بہوٹی ہوگیا۔ اور آنکھیں پھانسی پانے والے مجرم کی طرح ابل پڑیں —— بلغم کی دلدل میں پھنسی ہوئی کھانسی کی آواز سے اس کا جی متلانے لگا۔ وہ دھیان بھٹکانے کی غرض سے بیٹھک کے آدھ کھلے دروازے کے باہر دیکھنے لگا۔ لو کے تیز جھکڑ بگولوں دھول اڑاتے بھوتوں کی طرح ناچتے پھر رہے تھے۔ آسمان کے سایہ عاطفت میں کتنی ہی چیلیں ہوا میں قلابازیاں کھا کھا کر زور زور سے چیخ رہی تھیں۔ پاس پاس بنے ہوئے آدھے کچے آدھے پکے مکانوں کے دروازے بند تھے۔ اور سامنے کی چھوٹی سی تلیا میں ایک بھینس پڑی گرمی سے پناہ لے رہی تھی۔ کنارے پر کوئی راہگیر اپنی لٹھیا قریب رکھے دھوتی سمیٹے اکڑوں بیٹھا تھا۔ اور اس سے تھوڑے فاصلے پر چند سؤر اپنی سیاہ تھوتھنیاں لٹکائے، راہگیر کے اٹھنے کا انتظار کر رہے تھے۔

"اب لکھو بھیا" کھانسی کا دورہ ختم ہونے کے بعد وہ دبلی دبی سانسوں کے درمیان بولی۔

"ہاں —— بولو جلدی جلدی کیا لکھیں؟"

"تم یہ لکھو بھیا کہ تم ہو تو اپنے باپ سے پرے ہو حرا——" قلم اس کے ہاتھ میں کانپ کر رہ گیا۔ ایک گاؤں میں بسنے والی تائی کی اولاد۔ جس نے ہوش سنبھالنے سے پہلے ہی بھائی کے سامنے سلیقے سے ڈوپٹہ اوڑھنا سیکھ لیا ہو گا۔ اور بھائی کے سامنے نظریں اٹھا کر بات کرنے کی کبھی ہمت نہ پڑی ہو گی، وہ بغیر سلام دعا کے اپنے بھائی کو خط کے شروع ہی میں یہ کچھ لکھوا دے۔ اسے ایسا محسوس ہوا کہ لو کا ایک گرم جھونکا اس کے دماغ میں داخل ہو گیا ہے۔

گرمیوں کی چھٹیوں میں جب وہ اپنے ننھے منّے گاؤں آیا کرتا تو وہاں کے لوگ مارے احترام کے پڑھنے لکھنے کا سارا کام اسی سے لیا کرتے "فلاں کو خط لکھ دو بھیا اللہ نے تم کو علم دیا ہے" "یہ خط پڑھ دو بھیا تکلیف تو ہوگی۔ پر بھگوان نے تم کو علم دیا ہے" "مہاجن کے پاس کھیت رہن رکھوانا ہے۔ میاں جرا چل کر لکھا پڑھی کرا دو" عورتیں بھی اس سے خط لکھوانے آیا کرتیں شہروں میں کام کرنے والے شوہر، باپ یا بھائی کو۔ ایسے خلوص سے بھولا بھالا خط لکھواتیں کہ اسے گاؤں میں رہنے والی معصوم معصوم عورتوں پر پیار آنے لگتا۔

"تمہارا دماغ تو نہیں خراب ہو گیا ہے چاچی، جو اپنے بھیا کو ایسا خط لکھوانے بیٹھی ہو؟" اس نے بڑی کڑوی نظروں سے کلو کی بیوی کو دیکھا۔

"تمہاری ہاہا کریں بھیا، ہم جو کچھ کہیں وہ لکھتے جاؤ۔ تم نے تو ہم کو جبان دی ہے۔ کہ جو کچھ ہم لکھائیں گے تم لکھ دوگے۔ اور کل بات اپنے تک رکھوگے کیسا میرا بھیا۔ لکھ دو۔ تمہارے پاؤں پڑوں۔ اللہ نے تم کو الم دیا ہے" کلو کی بیوی مجسم خوشامد بنی بیٹھے ہی بیٹھے اپنے دبلے پتلے جسم کو گھسیٹتی اس کے پیروں کی طرف بڑھی۔ لیکن اس سے پہلے کہ انسان کا سر دوسرے انسان کے قدموں پر جھکتا، وہ ایک دم کھانسی کے چنگل میں پھنس گئی۔

"اچھا اچھا، چلو اب جلدی بولو" اس نے قلم انگلیوں میں تھام کر نفرت سے کلو کی بیوی کو دیکھا۔

"ہاں ——— آں" وہ کھانسی کے تیز جھکڑ میں گنگنائی اور پھر جیسے ہی کھانسی

کا دورہ ختم ہوا! پسینہ پونچھ کر لمبی لمبی سانسیں لیتے ہوئے بولی۔" ہم نے جو
جو بولا تھا لکھ لیا بھیّا کہ تم ہو تو اپنے باپ سے پر ہو ح ۔ ر ۔ ا ؟"
"ہاں لکھتے ہیں"! اس کے چہرے پر نفرت آمیز شرارت کی ایک تیز لہر
رینگ گئی اور اس نے سادے کاغذ پر لکھنا شروع کیا ـــــ "تمہیں بلاس پور
میں رہنے والی بہن کا سلام پہنچے اور پھر تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ میں ہوں تو اپنے
باپ سے پر عادتوں کی ہوں حرا ـــــ" قلم کاغذ پر ایک ہلکی سی کھڑکھڑاہٹ
کے ساتھ ایسی عبارت پھیلا رہا تھا۔ جس سے کلرک کی بیوی کی ـــــ اچھالی
ہوئی گندگی خود اسی پر برس رہی تھی ـــــ تعلیم یافتہ مرد ایک جاہل عورت سے
دغا کر رہا تھا۔ ایک دوسرے مرد کی حمایت میں ـــــ ایک کمزور دل کی
مریض ادھیڑ عمر کی عورت سے دغا۔ مگر وہ مجبور تھا۔ وہ کالج میں پڑھتا تھا۔ شہروں میں
گھوما تھا۔ جہاں اُس نے عورت کی دلیریوں کو اپنے حساب بڑے عجیب عجیب
تباہ کن انداز میں دیکھا تھا۔ اسے وہاں نہ تو دیہاتی عورتوں جیسی شرم دِیا نظر
آئی تھی۔ نہ پاس و لحاظ۔ اسے سب کی سب منہ پھٹ اور بے باک نظر آئی
تھیں۔ جو مشرق کی روائتی تہذیب کے پردوں کو نوچے ڈال رہی تھیں ـــــ
انتہائی غلط طریقے سے ـــــ اور اسے اعلیٰ تعلیم یافتہ لڑکیوں سے تو حد سے
زیادہ نفرت تھی۔ کالج میں ایک لڑکی نے کھلم کھلا عشق بازی کی۔ اور جب لڑکی
کے بھائی نے اسے تنبیہ کی تو اُس نے بھری کلاس میں بھائی کی بدعنوانیوں
کو گنوا کر اسے ذلیل کر دیا تھا ـــــ اب بھلا وہ عورت کی اتنی آزادی کیسے
برداشت کر سکتا تھا۔ آخر وہ دیہات کی "پیداوار" تھا۔ اُس نے آنکھ کھول

سکا تھا۔ مگر یہ گم سم سی لڑکی صرف باہیں پھیلا کر اسے کس قدر متاثر کر گئی تھی اس کے دل جیسے نازک گوشت میں بھرپور چٹکی لے گئی تھی ۔

جب وہ جی بھر کر رو چکا تو اس نے قدموں سے روندی ہوئی بال پنوں اور کلیوں کو سمیٹ کر ایک طرف رکھ دیا۔ انہیں دیکھتا رہا۔ انہیں چھوتا رہا۔ اور ہلکی سی نم تولیہ کو اٹھا کر سہلاتا تھا۔ اور پھر اس بستر کو دیکھنے لگا۔ جس پر اس قدر شکنیں پڑی ہوئی تھیں کہ جیسے اس پر مسلسل کئی دن تک کوئی پڑا کروٹیں بدلتا رہا ہو۔ پاؤں رگڑتا رہا ہو۔ وہ سوچنے لگا کہ اس خوبصورت اور عجیب لڑکی نے تین دن تین راتیں اس بستر پر تڑپ کر گذاری ہیں اور پھر وہ اٹھ کر آہستہ آہستہ بستر کی شکنیں درست کرنے لگا۔ تکیہ پر جگہ جگہ آنسوؤں کے بڑے بڑے دھبے پڑے ہوئے تھے۔ تین دن مسلسل تین دن تک روتی رہی اور پھر اس نے تھکن سے نڈھال ہو کر منہ دھویا تھا۔ تاکہ اس میں پھر رونے کی سکت پیدا ہو جائے اور پھر اپنے بال سنوارنے بیٹھ گئی تھی۔ لیکن بال کیوں سنوار رہی تھی۔ اس نے صابن سے منہ کیوں دھویا ـــــــ اگر تھک گئی تھی تو منہ پر یوں ہی پانی کے چھینٹے بھی تو دے سکتی تھی۔ مگر اس نے تو باقاعدہ صابن سے منہ دھویا تھا۔ اور انہماک سے سنگار کر رہی تھی ـــ شہر میں سناٹا تھا۔ اس کی بلڈنگ میں سناٹا تھا۔ موت سب کو نگل گئی تھی۔ پوری بلڈنگ میں بھیانک ویرانی تھی۔ زندگی کا اس پاس کیا دور دور پتہ نہ تھا۔ وہ سنگار کر رہی تھی۔ اس تنہا خاموش کمرے میں مسلسل تین دن رو چکنے کے بعد سنگار کر رہی تھی تھکن

سے نڈھال اور چور۔ آخر وہ کس کے لیے سنگار کر رہی تھی۔ کیوں۔ وہ کونسا
جذبہ تھا۔ کتنی عجیب، کتنی حسین لڑکی ـــــ اور جب سے اٹھا کر لے گئے تو وہ
چپ چاپ چلی گئی ـــــ اور پھر اس کے دل و دماغ کو دو پھیلی ہوئی باہوں
نے جکڑ لیا۔ کاش وہ اس تھکی تھکی نڈھال لڑکی کا سر اپنے زانو پر رکھ سکتا۔ اس کے
سرخ پھولے ہوئے پپوٹوں کو سہلا سکتا۔ وہ اس کے لئے وہ سب کچھ کر سکتا
جو وہ چاہتی تھی۔ اور پھر وہ کچھ نہ کر سکنے کے جذبے نے اسے بے چین کر دیا
اس نے سرہانے سے تکیہ اٹھا کر اپنی گود میں رکھ لیا۔ تکئے کے نیچے ایک کاغذ
پڑا ہوا تھا۔ میلا بوسیدہ وہ اسے کھول کر پڑھنے لگا۔ میری جان! وہ
پورا خط جلدی جلدی پڑھ گیا۔ لیکن آخر میں جب وہ پڑھ رہا تھا کہ میں تم سے
جلد ہی آ کر ملنے والا ہوں۔ میں تمہیں دیکھنے کے لئے بے حد بے چین
ہوں۔ اتنا بے چین کہ اگر میری راہ میں کوئی بڑے سے بڑا طوفان بھی
حائل ہو جائے تو وہ مجھے تم تک پہنچنے سے نہ روک سکے گا۔ میں تمہارے پاس
سیدھا تمہارے کمرے میں پہنچوں گا۔ جہاں تم بنی سنوری بیٹھی میری راہ دیکھ
رہی ہو گی۔ اور ـــــ ہاتھ کانپے۔ خط چھوٹ کر زمین پر گر گیا۔

نیچے اچانک شور ہونے لگا۔ دھما دھم کی تیز آوازیں آنے لگیں۔ شاید قریب
کی کسی بلڈنگ کا سامان لوٹا جا رہا تھا۔ اس نے بال پنیں اور کلپ اٹھا کر جیب
میں ڈال لیئے۔ اور لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے سیڑھیاں طے کر کے چپ چاپ
گھر کی طرف چل پڑا۔

سوچتے سوچتے اس نے ایک بار پھر نالی کی طرف دیکھا۔ پانی بہہ چکا تھا
اور صابن کا جھاگ بجھ کر ختم ہو چکا تھا۔

محافظ الملک

کہتے ہیں کہ سیفٹی ایکٹ برطانوی سامراج کے بطن مبارک سے پیدا ہوا
اس بچے کی مانگ دوسرے رجعت پسند حکمرانوں کے ملکوں میں جیسی کچھ ہو مگر
ہمارے ملک میں ہمارے ہی بھائی بندوں کو سونپ کر حکم دیا گیا کہ اسے قیمتی
پالنوں میں پرورش کرو۔ یہ بچہ جوان ہوگا تو بہت کام آئے گا۔ پوت کے
پاؤں پالنے ہی میں نظر آجاتے ہیں۔ واقعی بچہ ہونہار ثابت ہو رہا تھا۔
خضر کی وزارت کے زمانے میں تو مانا ہوا سعادت مند ثابت ہوا۔ مگر
بدقسمتی کہیے کہ آزادی کی گڑبڑ مچی تو بچہ پالنے میں تنہا پڑا پڑا سسکیاں بھرتا رہا
کوئی پرسانِ حال نہ رہ گیا۔ گورے آقا اپنی حکومت خاتمے پہ دیکھ کر مع اپنے

کنڑول کے واپسی کی سوچ رہے تھے۔ یعنی بظاہر آزادی کا دور پوری طرح آگیا تھا بچہ اس ہڑبونگ میں بھوکا پیاسا رہتے رہتے شاید مرجاتا۔ مگر۔ اس ناجائز بچے کو نئی تبدیلی مملکت کے اس کرتا دھرتا ؤں نے اٹھاکر سینے سے لگا لیا جو وقت اور مصلحت کی وجہ سے اس کے ناجائز ہونے کے طعنے دیا کرتے تھے۔ اب بچے کی پرورش اور بھی شاندار طریقوں سے ہونے لگی۔ سونے کے پالنے میں رکھا گیا جس میں تمام بیش بہا جواہرات لگے ہوئے تھے۔ بہترین غذائیں دی گئیں اور کوشش یہ کی گئی کہ وہ جلد از جلد جوان ہو کر اپنے پیروں پر کھڑا ہو جائے۔ "حاسدوں" کی کچھ کمی نہیں۔ ملک کے گوشے گوشے میں بھرے پڑے ہیں۔ کون جانے کہ کب کیا ہو جائے۔

لوگوں نے یہ چاؤ چونچلے دیکھے تو چونک پڑے کہ آخر یہ راز کیا ہے؟ کہاں تو ناجائز قرار دے کر گالیاں دیتے تھے اور کہاں اب سینے سے لگا رکھا ہے۔ لیکن کچھ دنوں تک یہ بات معلوم نہ ہو سکی۔ مگر لوگوں کو کیا کہئیے، ایسے کھوجی ہوتے ہیں کہ خدا کی پناہ۔ راز سفا معلوم کر لیا جناب یہ تو اس ناجائز بچے کی حقیقی خالائیں نکلتی ہیں۔ ماں مرے ماسی جیئے کی مثل مشہور ہے وہ کچھ غلط تھوڑا ہی ہے۔ پھر خالائیں اپنے جگر گوشے کو کیسے پھینک دیں۔ اقتدار ہاتھ آہی چکا ہے۔ اور اقتدار کے ملبے کے نیچے تو نہ جانے کیا کچھ دبا دیا جاتا ہے۔

لوگ سرگوشیاں کرتے رہے پھر کسی کا بگڑا کچھ نہیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے بچہ بچپن سے قلانچ بھر کر جوانی کی حدود میں داخل ہو گیا۔ سیفٹی ایکٹ جاگیرداروں کی طرح بھرپور طوفانی شباب کے علاوہ کسی دوسری خوبی کا مالک نہ تھا۔ وہ بھی ایسی جوانی کی دھرتی

اس بوجھ سے کانپ اٹھے۔ شاید اسی لئے کہنے والے کہتے ہیں کہ سیفٹی ایکٹ پہ
شباب آنے سے پہلے جب ایک آدھ بار اس آزاد سرزمین پر زلزلے کی کیفیت
طاری ہوئی تو دراصل دھرتی یہی سوچ کر کانپتی تھی کہ میں بیچاری زمین اس بوجھ کو
کیسے سنبھالوں گی ـــــ مگر کسی نے سچ ہی کہا ہے کہ بے ڈھنگے، شباب سے
خدا ہی بچائے۔ پھر بھلا ایسی باتیں کون سوچتا۔ سیفٹی ایکٹ اپنے مضبوط ہاتھ پاؤں
یوں پھیلا بیٹھا کہ "پاک" زمین کا ایک ایک باسی سوچ میں پڑ گیا۔

سرگرشیاں بڑھیں اور لوگ چیخنے لگے۔ ہٹاؤ اس دیو جیسی ہیبت ناک چیز
کو لیکن کون سنتا کانوں میں تو اقتدار کی روئی ٹھنسی ہوتی تھی۔ پھر یہ بات بھی
تو تھی کہ مقوی غذائیں کھلا کھلا کر پالا تھا۔ کلیجے سے لگا کر لوریاں دی تھیں۔ لاڈلا پوت
تھا۔ بھلا آسانی سے قید و بند میں لایا جاتا۔ خالائیں چڑچڑا اٹھیں۔ اسے لو، ہمارا
لاڈلا جوانی کو جاڑے کی چاندنی سمجھے، واہ کہاں کا انصاف ہے۔ لاڈلا تو گھر کی
حفاظت کرتا ہے اور کمبخت بے وقوف چیخنے ہیں۔ پتہ نہیں اسے ہٹا کر کیا کرنا
چاہتے ہیں۔ لوگوں کے منہ میں خاک، یوں ہی ہر چیز میں کیڑے نظر آتے ہیں۔
ایسوں کو سدسنٹ کر کے جلا وطن کر دوں، اسے کیا ہوا جو گھر کی حفاظت میں
سوائے ایک آدھ بے گناہ بھی کام آجائے۔"

شباب کی آندھی جب تیز ہوئی۔ تو لوگ تنکوں کی طرح اڑنے لگے۔
"سیفٹی ایکٹ" جس کا جوانی کا نام "سیفٹی آرڈی ننس" رکھا گیا۔ اور خطاب "محافظ الملک"
کا دیا گیا۔ ملک کی حفاظت کے سلسلے میں اپنے روزمرہ کے کارناموں کی فہرست
بنا نا جرم کسنے والوں کا حال بھی لکھنا اور اپنی قیمتی رائے بھی۔ پھر رات کو بستر استر احت!

پر جانے سے پہلے اسے دیکھتا؛ خوش ہوتا۔ اس کے بعد خلاؤں سے دعائیں لیتا اور خواب خرگوش کے مزے لوٹنے لگتا۔

محافظ الملک نے بجلی کے سبز قمقموں کی روشنی میں اپنے آج کے کارناموں کی فہرست پر نظر ڈالی۔

گلی کی ایک چھوٹی سی دوکان پر ایک بے حد دبلا پتلا آدمی چھ سات آدمیوں کے ساتھ کھڑا زور زور سے باتیں کر رہا تھا۔ "کون کہتا ہے کہ اس زرخیز خطۂ زمین پر بھوک نہیں ہے۔ زمین زرخیز ضرور ہے۔ مگر اسے ہموار کرنے کا اجازت نہیں، یہ یہاں کا پرانا چلن ہے۔ "کہ گندم بو اور بھوک کاٹو" ـــــ اس سے زیادہ سننے والا یقیناً ملک کا وفادار نہیں ہو سکتا۔ اس لیئے میں نے آگے بڑھ کر اسے گرفتار کر لیا، اس شخص کی باتیں اس زرخیز خطۂ زمین کی ہتک کر رہی تھیں۔ جہاں زمین اناج کے ڈھیر اگلتی ہے۔ اس نابکار کو جیل میں ڈالنے سے پہلے پوچھا "اب تو سچ بتا دے۔ "کیا تو بھوکا رہتا ہے؟" تو بولا "حضور یہ تو میری صورت بتلا رہی ہے اور آپ خود ہی غور سے دیکھ لیجئے کہ میری صورت پر اس طرح گندم نہیں برس رہی ہے۔ جس طرح آپ کے" ـــــ آدمی یقیناً گستاخ ہے اور ملک کیلئے خطرناک

مزدوروں کا ایک زبردست ہجوم تھا۔ اور مزدور راہنما گلا پھاڑ پھاڑ کر تقریر کر رہا تھا۔ لوگوں اپنی اجرتوں میں اضافہ کرائے بغیر دم نہ لو۔ حکومت کو اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت کا ذمہ دار ٹھہراؤ۔ اپنی رہائش کے لیئے حکومت سے مکان مانگو۔ تم جن ڈربوں میں رہتے ہو آخر ان میں کتنے دن جی سکو گے، تم کس طرح اطمینان کی ایک سانس لے سکو گے۔ اور اگر حکومت تمہارے مطالبات پر کان

نہیں دھرتی تو اس میں ہول سے معلق رہنے اور خاک پھانک کر زندہ رہنے کے گر معلوم کرو ورنہ ـــــــ معاملا کافی خطرناک تھا۔ یہ لیڈر یقیناً سب سے زیادہ ذلیل چیز ہے۔ اگر عوام کو تحت الثرا میں پہنچانے کے لیے حکومت کا ساتھ دے گا۔ تو ایسے بے ڈھنگے پن سے کہ چند ہی دنوں میں اپنا اور حکومت دونوں کا منہ کالا کیا دے۔ اور اگر سچ مچ عوام اس کے ساتھ ہے تو حکومت کے تحت کی سلامتی انشور کرانے کے بعد بھی غیر محفوظ ہی رہے۔ چار چار ٹکے کے آدمیوں سے حکومت جیسی باوقار ہستی پر غلاظت اچھلوائے۔ اب حد ہے کہ بیچاری حکومت پرانے مکان گروا کر چونے ہوا رہی ہے تو کیا اس نے امیروں کی چھاپ لگا دی ہے کہ رہیں گے تو وہی رہیں گے۔ خدا توفیق دے تو یہ چار ٹکے والے بھی کرایہ ادا کریں۔ اور رہیں۔ کیا حکومت منع کرتی ہے ایسے نامعقول کمبخت' اگر حکومت نے جلد ایسے لیڈروں کی کاشت نہ رکوائی تو پھر ہو چکی ملک کی حفاظت"۔ لیڈر کو جلاوطنی کی نایاب سزا سے نوازا گیا۔

ایک ادیب کو قید کیا گیا' ایڈیٹر کو جلاوطنی کی سزا دی' ادبی رسالے کو چھپنے سے بند کیا گیا۔ بک سٹال کے کاونٹر پر بھی چھ مہینے کی پابندی لگا دی ہے کہ اب یہاں کوئی کتاب یا رسالہ نہ رکھا جائے۔ اس رسالے میں ادیب کی کہانی کا یہ ٹکڑا قابل اعتراض تھا۔ میری غریب بہن میں دیکھ رہا ہوں کہ تیرے چہرے کی سرخی غائب ہوتی جا رہی ہے۔ تیرے ہونٹ سفید پڑتے لگے ہیں۔ تیرے گالوں کے گلاب مرجھا گئے ہیں۔ ایک خوبصورت چہرے اور ایک ننھے سے گھر کا انتظار کرتے کرتے تیری آنکھوں کے دیئے بجھ چکے ہیں مگر میری بہن

تیرا بھائی بہت غریب ہے وہ تیرے لیے صرف دو دو جوڑے کپڑوں کا بھی انتظام نہیں کر سکتا صرف دو جوڑے کپڑے دے کر تجھے رخصت نہیں کر سکتا کہ تیری ساس تجھے ساری زندگی خالی ہاتھ آنے کے طعنے دیتی رہے"۔۔۔۔۔۔

یعنی ظاہر ہوا کہ اس ملک کا حسین و جمیل سرمایہ گھروں میں پڑا مرجھایا کرتا ہے اس ملک میں شادی کے نقارے نہیں بجتے۔ یہ اس ملک کے خلاف غلط پروپیگنڈہ ہے۔ کل ہی میں نے کئی شادیاں دیکھی ہیں۔ جو ہمارے شہر کی رونق کو دوبالا کر رہی تھیں۔ باراتیں کاروں پر تھیں اور قسم قسم کے باجے بج رہے تھے۔ پتہ نہیں یہ ادیب کس دنیا کی باتیں کرتے ہیں بہر حال ایسے ادیب کھلی فضا میں جینے کے لائق نہیں وہ اور ہی ادیب ہوتے ہیں۔ جو ٹھاٹ سے کھاتے کماتے ہیں۔ اور لگے ہاتھوں حکومت سے ایک اچھا سا عہدہ بھی جھٹک لیتے ہیں۔ مگر یہ ادیب تو حکومت کے لیے زہر ہیں۔

محافظ الملک کو ادیب پر بے حد غصہ آگیا تھا۔ اسی لیے وہ ذرا دیر تک زیر لب بڑبڑاتا رہا پھر فہرست پر آگے نظر دوڑائی۔

ایک بدبخت شاعر کو بھی قید کیا گیا، اس کی نئی کتاب کو غیر قانونی قرار دیا گیا۔ پبلشر کو بھی قید کیا گیا۔ اس کتاب میں ایک نظم کا ایک شعر بڑا ہی انقلابی تھا جس کا مفہوم یہ تھا "اے میری محبوبہ ابھی محبت کے گیت نہ گا۔ ابھی ہم صحیح معنوں میں آزاد نہیں۔ ابھی تو میرے ساتھ انقلاب کے گیت گا" اس شعر سے مفہوم بھی نکلتا ہے کہ اے عورت! گھر سے بے پردہ نکل پڑو۔ اور ہمارے ساتھ انقلاب کے گیت گاؤ۔ بلکہ ہماری آنکھیں سینکو۔ بڑے اوباش ہوتے ہیں یہ شاعر

بھی، تفریح طبع کا سامان بہرحال چاہیئے ۔ کمبخت بڑے ڈھیٹ ہوتے ہیں ۔ یہ ادیب اور شاعر مولویوں کا ایک مخصوص گروہ پیچھے لگا رکھا ہے کہ ان کے خلاف نت دن پر فتوے دیئے جائیں ۔ مگر باز نہیں آتے ۔ خاص خاص اخبار اور رسائل بھی اس کی خبر لیتے رہتے ہیں ۔ مگر یہ ہیں کہ جیئے جاتے ہیں جب دیکھو گڑبڑ مچا دیں گے ۔ کیا ہی اچھا ہو کہ ہماری حکومت غیروں کے طعنوں کا نیاں کیے بغیر اپنے ملک میں ان کی بھی کاشت بند کرا دے ۔

ایک نامعقول اخبار کے ایڈیٹر کو بلا وطن کر دیا ۔ جب دیکھو اپنے ایڈیٹوریل میں دولتِ مشترکہ سے الگ ہونے کے مشورے دیتا رہتا ہے ۔ یہ شخص بہت ہی خطرناک تھا ۔ یعنی وفاداری کا کوئی مفہوم اس کے بھیجے میں سماتا ہی نہ تھا ۔

اور پھر محافظ الملک نے بیسیوں معمولی معمولی کارناموں کو بھی دیکھ ڈالا ۔ جو بہت اہمیت نہ رکھتے تھے ۔ مثلاً ایک شخص شفق کو سرخ کہہ رہا تھا ۔ اس لیے اسے قید کر دیا گیا ۔ ایک اور شخص بات کرنے میں بار بار سرخ ہو تا جاتا تھا ۔ اس لیے اسے بھی قید کر دیا گیا ۔ سرخ رنگ برا ہوتا ہے ۔ پیلا ہونا چاہیئے تیسرا شخص کہہ رہا تھا ۔ کہ آج گھر میں روٹی نہیں پکی ۔ روٹی نہیں پکی ہو گی تو پلاؤ پکا ہو گا مگر اس نے دوسری بات نہیں بتائی ۔ وہ ملک کی زرخیزی کو بدنام کرتا ہے چوتھا شخص کہہ رہا تھا ۔ کہ ہواؤں میں تیزی ہے ۔ حالانکہ اس وقت ہوا نازک حسینہ کی طرح اٹھکیلیاں کر رہی تھی ۔ یہ اشارہ ذرا بری طرف جاتا ہے وغیرہ وغیرہ ۔ ۔ ۔

اتنی لمبی فہرست دیکھتے دیکھتے محافظ الملک کا جی بولانے لگا ۔ تھکان

سے جماہیاں آنے لگیں - آج تو اگلے پچھلے سارے کارناموں کے ریکارڈ توڑ دئے گئے تھے - اس نے جلدی سے زیرِ غور کارناموں کی فہرست بھی دیکھ ڈالنا چاہی - مگر پہلے ہی کارنامے پر اسے نیند اچاٹ ہوتی نظر آئی - اس زیرِ غور کارنامے کی بڑھیا کے آنسوؤں نے اسے ایک کشمکش میں مبتلا کر دیا تھا - وہ پھر سوچ میں پڑ گیا - اس نے بڑھیا کی کیفیت کا ذکر کرتے ہوئے لکھا تھا۔

وہ ایک بالکل بوڑھی کھوسٹ عورت تھی - مگر اس کی آواز میں بڑا دم تھا - بیچ بازار میں اس نے چیخ چیخ کر بہت سے آدمیوں کو جمع کر لیا تھا - اور کہہ رہی تھی ــــــ لوگو! میں لٹ گئی - میں بڑھیا مہاجر ہوں - میرے چار بیٹے فساد میں مارے گئے - میرا صرف ایک بیٹا بچا تھا - جو ڈیا ڈھوڈ ہو کر اس بوڑھی جان کا پیٹ پالتا تھا - مگر اسے بھی گرفتار کر کے چھ مہینے کے لئے قید کر دیا گیا ہے - مجھے معلوم ہوا ہے - کہ میرے بچے کو قید کرنے والا "سیفٹی" ہے - مجھے اس سے ملاؤ - میں اس سے پوچھوں گی - کہ میرے لال نے، میری دولت نے اس کا کیا بگاڑا ہے - لوگ کہتے ہیں کہ تمہارا بیٹا روٹی مانگنے والوں کے گروہ میں سے پکڑا گیا - مگر مجھے کوئی بتائے کہ میرا بیٹا روٹی مانگ سکتا تھا؟ روٹی اس کے باپ نے نہیں مانگی - دادا نے نہیں مانگی - روٹی اس کی سات پشتوں نے نہیں مانگی کبھو تو ہمیں ورثے میں ملی تھی - لیکن ہمیشہ خدا کا شکر ادا کیا - اپنی حالت پر قناعت کی کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلایا - ہم نے کسی سے روٹی نہیں مانگی - میں سیفٹی

کا دامن پکڑ لوں گی۔ مجھے لے چلو، میرے بھائیو! میرے بچو! میری مدد کرو میں سیٹھی کا گریبان پکڑ لوں گی۔ مجھے لے چلو۔"

بڑھیا کا جسم مارے جوش کے کانپ رہا تھا۔ آنکھیں ابل رہی تھیں۔ سننے والوں کے چہرے کانوں تک سرخ تھے۔ اور نہ جانے کہ وہ سب کیا سوچ رہے تھے۔ پھر جب بڑھیا کا جوش ذرا کم ہوا تو ایک شخص نے آگے بڑھ کر بے حد غصے سے میری عظیم موجودگی کا احساس دلایا۔ اور بڑھیا کا لہرہ اچانک دور ہو گیا۔ اس کی آنکھیں گڑھوں میں دھنس گئیں۔ اور وہ زور سے چیخی۔۔۔۔ "لوگو! بھاگو یہاں سے کھڑے کیا تماشہ دیکھ رہے ہو۔ بھاگ جاؤ۔" اور پھر اس نے اپنے تار تار دوپٹے کے پلو کو زمین پر بچھا کر صدا لگائی۔ اللہ بھلا کرے بابو جی۔ یہ بڑھیا تین وقت کی بھوکی ہے۔ اور میں نے دیکھا کہ بڑھیا کی آنکھوں سے آنسو چپکے چپکے بہہ کر اس کے میلے کپڑوں میں منجذب ہو رہے تھے۔

بڑھیا یقیناً ملک کی حفاظت کے سلسلے میں روڑا ثابت نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ وہ بزدل ہے مگر اس کے آنسو؟ اس کے آنسو ضرور خطرناک تھے۔ کیونکہ وہ ایک نڈر مجمع نے دیکھے تھے اور نہ جانے کتنے ہی ایسے اور انسان بھی دیکھیں گے۔ پھر ناممکن ہے کہ وہ ان سے اثر نہ لیں۔ بے بس کے آنسو صرف لوگوں کو ہی متاثر نہیں کرتے بلکہ حکومت کے دو محلے بھی سیلاب کی زد میں آجاتے ہیں۔ تو پھر۔۔۔ پھر ضروری ہے کہ بڑھیا کو قید کر دیا جائے۔ رحم تو آتا ہے کہ بے چاری

بے گناہ ہے۔ حکومت سے ڈرتی بھی ہے۔ مگر کیا کیا جائے ـــــ قید ـــــ صرف قید ـــــ کیونکہ اس کے آنسوؤں کو "بین" نہیں کیا جا سکتا۔

محافظ الملک نے اپنا فیصلہ لکھ دیا۔

تین عورتیں

دو منزلہ مکان کی چھت سے نظر آنے والے، مولوی چمن کے اجاڑ باغ کے
وہ تینوں سر جوڑے ہوئے اونچے درخت، چپ چپ کھڑے تھے، اور
ان کے پیچھے سے چاند اس طرح نکل رہا تھا جیسے درختوں میں لگے ہوئے کسی
ایک گھونسلے میں کسی نے چپکے سے آگ لگا دی ہو۔ ٹھہری ہوئی ہوا میں درخت
گھٹے گھٹے سے چپ چاپ کھڑے تھے۔ اور ان کے گرد سرخی مائل پیلاہٹ
چھائی ہوئی تھی ــــ رات کا ابتدائی حصہ گزر چکا تھا۔ جلدی سے ویران ہو
جانے والی سڑک پر کوئی آوارہ کتا وقفے وقفے سے رو رہا تھا۔ اور اس کی
نحوست کے بوجھ سے دبی ہوئی آواز، روتی ہوئی قدسیہ کو ہر بار نئے سرے سے
ایک دیرانے میں کھینچ لے جاتی۔ وہ جانے کتنی دیر سے اپنے پلنگ پر گٹھری کی

طرح گڑی مڑی بنی پڑی رو رہی تھی ۔ بالکل اس طرح جیسے برسات کے ان گھرے ہوئے بادلوں کے زور شور سے برسنے کے بعد ہلکی ہلکی پھوار پڑنے لگے جن میں بوندیاں پڑنے کی ٹپ ٹپ نہ ہو اور لوگ سمجھیں کہ اب برس چکا لیکن جب باہر نکل کر دیکھو تو ننھی منی ٹھنڈی بوندیاں ہوا کے جھونکوں کے ساتھ آکر منہ دھلا جائیں۔ ساری جان میں جھرجھریاں پیدا کردیں۔ تو کچھ اسی طرح وہ بھی رو رہی تھی کہ پاس پاس بچھے ہوئے پلنگوں پر لیٹی بیٹھی بہن اور بھاوج کو پتہ بھی نہ تھا کہ وہ اب تک رو رہی ہے ۔ شام کی ڈاک سے اسے یہ خط موصول ہوا تھا کہ جو شخص اس سے محبت کرتا تھا اور جو رم جھم کے پیارے سے موسم میں اس سے شادی کرنے والا تھا۔ اور اب اس نے گرمیوں کو طویل ہوتے دیکھ کر ایک دوسری ہی لڑکی سے محبت کر کے شادی کرلی ہے تو اسے خط کی عبارت پر دیر تک یقین نہ آیا تھا۔ لیکن جب اس نے خط کئی بار پڑھ لیا، اور خط کی عبارت کسی بار بھی نہ بدلی تو وہ اس بچے کی طرح تلملا کر رونے لگی، جس کے نازک گال پر ایک زور کا تھپڑ مار دیا گیا ہو۔ اور پھر وہ روتے روتے زمین پر لیٹ گئی تھی ۔ کچھ اس طرح جیسے اب اس کے لئے دنیا میں کچھ نہیں رہا۔ بس وہ زمین میں سما جانا چاہتی تھی بھاوج اور بہن نے اسے بڑی مشکل سے سمجھا بجھا کر پلنگ پر ڈالا تھا۔ اور وہ ذرا دیر کے لئے تھکی سی آنکھیں موند کر چپ ہو گئی تھی۔ بہن اور بھاوج نے یہ سمجھ کر کہ اب وہ سو رہی ہے ، اپنا اپنا بستر سنبھال لیا ۔ ـــــ خط آنے کے بعد سے دونوں خود بے حد بے چین اور مضطرب نظر آرہی تھیں۔ ایسا اضطراب

جیسے وہ طرح طرح سے ——— چھپانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اور وہ تھوڑی دیر چپ رہ کر پھر رو رہی تھی۔ چپکے چپکے، بس مسلسل پھوار پڑے جا رہی تھی۔ آنکھوں کی جلن تیز ہوتی جا رہی تھی۔ اور جب اس کی آنکھوں کی جلن برداشت سے باہر ہونے لگی تو وہ بہت سی آہیں اور سسکیاں اپنے گلے میں گھونٹ کر اپنے گرد و پیش دیکھنے لگی۔ کتنی ویرانی اور اداسی چھائی ہوتی تھی۔ ایسی ویرانی، جیسے موت بھرے پرے گھر سے کسی ایک کو چن کو سب کو ویران کر گئی ہو اسکی بہن ذکیہ اپنے صاف ستھرے بستر پر بیٹھی تکیے اوپر پاؤں رکھے۔ زور زور سے ہلا رہی تھی۔ روز کی بہ نسبت آج اس کے پاؤں کہیں تیزی سے ہل رہے تھے۔ اس کی مندی مندی سی آنکھیں نہ جانے کس نقطے پر جمی، ایک ٹک دیکھے جا رہی تھیں۔ اور اسکے پائینتی پائے سے بندھا ہوا کتے کا ننھا سا جھبرا، زمین پر سونے کی بجائے اسکی ریشمی دولائی میں منہ چھپائے پائینتی سو رہا تھا؛ اور شاید اسے خبر بھی نہ تھی۔ وہ تو نہ جانے کیا دیکھ رہی تھی یوں پلک جھپکائے بغیر ا—— اور اس کی بھابی، معمول کے مطابق گھٹنے پر ٹھوڑی ٹکائے چپ چاپ اپنے بستر پر بیٹھی تھی۔ اس کے سامنے تپائی سے جگ مگ کرتا ہوا پان دان کھلا پڑا تھا۔ لیکن آج خلاف معمول اس کا سر وتا بار بار نہ کھڑک رہا تھا آج اس کے ادھار زر جن تلے اوپر کے بچے بھی یوں ہی کھلے پڑے تھے، جنہیں وہ رات ہوتے ذرا سے خنک ہونے پر گرم چادروں میں لپیٹ دیا کرتی تھی۔ لیکن آج رات کو خنک ہوئے کتنی دیر ہو چکی تھی۔ اور اس نے بچوں کو چادریں نہ اڑھائی تھیں۔ وہ نہ جانے کن سمندر جیسے گہرے خیالوں میں گم بیٹھی تھی۔ کہ اسکی مامتا بھی اسے تلاش نہ کر سکی اور وہ ننھی ننھی جانیں شبنم بھری رات کی سردی میں سکڑی پڑی تھیں

جانے وہ ننھی ننھی جانیں کیا دیکھ رہی ہوں گی۔ خواب میں شاید یہی کہ ان کی اماں
انہیں چھوڑ کر کہیں چلی گئیں، انہیں بڑے زور سے سردی لگ رہی ہے۔ ان کے پاس
کہیں دور چادریں نہیں، وہ چادریں جنہیں اوڑھ کر وہ بڑے آرام سے سویا کرتے تھے
—— لیکن وہ تو گم تھی۔ وہ اپنے بچوں کو چادریں اوڑھا کر ان کے خواب کی تعبیر بھی نہ
دے سکتی تھی، وہ ڈوب گئی تھی، ان سمندر جیسے خیالوں میں — وہ ذرا دیر تک
بھائی اور بہن کو دیکھتی رہی، کس قدر اُداسی برس رہی تھی۔ ان کے سفید سفید بستروں پہ
جیسے جوان کفنائی لاشیں —— اور پھر اس نے بھیگی بھیگی فضا میں ایک ایک
چیز کو دیکھ ڈالا —— مدھم، ڈوبے ڈوبے سے تارے ابھرتا ہوا چاند اور
مولوی جمن کے اجاڑ باغ کے دو تین سر جوڑے اونچے درخت، اسے سب اُداس
اور ویران نظر آئے۔ اور اس نے ان روح سوز نظاروں میں بے چینی کو بڑھتے
دیکھ کر پھر تکیئے میں منہ چھپا لیا۔ اتنی دیر تک رونے کے بعد بھی اس کی طبیعت ہلکی نہ ہوئی
تھی۔ اس کا جی ان بادلوں کی طرح امڈا چلا آرہا تھا۔ جو برسات کے دنوں میں تلے
اوپر امنڈتے چلے آئیں۔ بادل کی ایک پرت برس نہ چکے کہ دوسری سیاہ پرت
چھا جائے۔ تو اس کا جی بھی کچھ اس طرح اُمڈ رہا تھا۔ غم کی بھاری سل جو اچانک
اس کے سینے پر سرک آئی تھی، اسی طرح اپنی جگہ پر قائم تھی۔ اس کا اسی طرح رونے
کو جی چاہ رہا تھا۔ لیکن آنکھوں کی مرچیں بڑھ گئی تھیں۔ اور آنکھوں کے گوشوں سے ہر
پھوٹنے والا آنسو، رخساروں پر بہنے سے پہلے، ٹوٹی ہوئی پلک کی طرح اس کی
آنکھوں میں کھٹک جاتا۔ روتے روتے اس کا سر بھاری ہو گیا تھا لیکن وہ تھی کہ
روئے چلی جا رہی تھی۔ محبت کی ناکامی اور ذلت وہ احساس، جو اس کے مقابلے

میں ایک دوسری لڑکی کو چن کر اسے بخش گیا تھا۔ اسے بری طرح رلا رہا تھا۔ اور پھر ایک طویل سسکی اس کے لبوں کی قید سے نکل گئی۔ کچھ سوچتی ہوئی ذکیہ کو جھنجوڑ آئی۔

"تم سوئی نہیں اب تک قدسی؟"

"نہیں" —— قدسیہ نے اپنے دیر سے سکڑتے ہوئے جسم کو اور دائیں تک پھیلا کر جلتی ہوئی بند آنکھیں کھول دیں۔ اور وہ ہوا جو نہ جانے کہاں ٹھٹھک کر ٹھہر گئی تھی، اب آہستہ آہستہ چل پڑی۔ اور مولوی حسن کے باغ کے وہ تینوں اونچے درخت جیسے آپس میں آہستہ آہستہ ٹکر لینے لگے تھے۔ ان کے جڑے ہوئے سر ہٹ ہٹ کر ٹکریں لے رہے تھے۔

"لیکن تم تو روز اس وقت سوجایا کرتی تھیں! مگر ٹھیک ہی ہے، آج تو تمہارے رومان کی لاش تمہارے سامنے رکھی ہے" —— ذکیہ اپنے مخصوص لہجے میں کہنے لگی —— "بھلا تم اسے اٹھائے بغیر کیسے سو سکتی ہو۔ مگر میں تو یہی کہوں گی جان! کہ جنازے کو جتنی جلدی اٹھوا دو اچھا ہے۔ شرع اور فائدے دونوں کے لحاظ سے اب تم دیکھو نا! آج مجھے بھی زیادہ جاگنا پڑ رہا ہے اور بھابی بھی کچھ بے چین ہیں۔ ویسے تو یہ بیچاری روز جاگا ہی کرتی ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ آج بھی کسی امتحان کی تیاری میں راتوں کو جاگ کر پڑھ رہی ہوں۔ بس فرق اتنا ہے کہ پہلے موٹی کتابیں ہوتی تھیں ان کے سامنے، مگر اب کتابِ زندگی کے اوراق —— ایں نہ بھابی؟" —— بھابی نے کوئی جواب نہ دیا۔ شاید وہ کسی طرح گم تھی —— ہاں قدسیہ، ذکیہ کی باتوں سے تلملا اٹھی۔ اسے اس وقت تو ذکیہ

سے یہ امید نہ تھی۔ کہ وہ اپنی طنزیہ باتوں سے باز نہ آئے گی۔ اس وقت جب کہ وہ محسوس کر رہی تھی۔ کہ وہ بڑی بلندی پر پرواز کرتے ہوئے اچانک ایک غار میں گر کر زخمی ہو گئی ہے۔ تو اس وقت اسے نکالنے کی بجائے اوپر سے پتھر پھینکنا کہاں کی شرافت ہے! ——— مگر یہ حقیقت کب چھپے کہ رینگتا ہوا بچھو اپنا ڈنگ قابو میں نہیں رکھ سکتا، وہ رینگے گا تو عادت کے مطابق اس کا ڈنگ بھی اپنا کام کرتا رہے گا۔ اور اسے یہ خیال بھی نہیں آئے گا۔ کہ کوئی اس کی زد میں آکر تڑپ بھی گیا ہے۔

"اوہ"! قدسیہ نے مارے رنج کے اپنا سر تھام لیا۔

"اوہ! تو میرا خیال ہے کہ تم اس لاش کو دفنانے پر راضی نہیں۔ بالکل ان اماں جان کی طرح جو اپنے اکلوتے، کماؤ پوت کی لاش اٹھوانے پر کسی صورت راضی نظر نہیں آتی۔ لیکن یہ بھی تو سوچو قدسی کہ زیادہ رکھنے سے لاش میں ایسا تعفن بھی پیدا ہو جایا کرتا ہے۔ کہ تم تو تم، میرا یہ منا سا پلا بھی برداشت نہ کر سکے اور آخر تم بھی چیخ پڑو کہ خدارا اسے اٹھا کر پھینک دو۔ اسی لیئے کہا مانو، ورنہ کیا فائدہ کہ اس وقت کے ہمدردی سے سمجھانے والے تمہاری آخری حرکت پر زور سے ہنس پڑیں"——— ذکیہ کے لہجے کا طنز و تضحیک اس قدر نمایاں تھا کہ قدسیہ بے چیخ پڑی۔

"آپا۔ تم ———" اس کی آواز گھٹ گئی۔ اس کا غم ابھی تازہ تھا——— وہ یہ سب کچھ سننے کے لیے تیار نہ تھی۔ بس وہ سوگ منانا چاہتی تھی۔ ایک ایسا سوگ جو اس کی تمنا کے مطابق جلد از جلد۔ اسے موت سے ہمکنار کر دے۔ اس سے

ہے' اور اسے اس ترقی کے دور میں سات سال کے اندر چھ بچوں کی ماں بنا کر تنہا بھٹکنے کے لیے چھوڑ دیا جاتا ہے اور وہ بڑا سا پاندان سنبھال لیتی ہے۔"
ذکیہ نے ایک تلخ قہقہ لگایا۔ اور بھابی کے لبوں سے ایک طویل آہ نکل گئی۔

"سچ ہے"———— بھابی کے لہجے میں ایسا غم کروٹیں لے رہا تھا کہ جانے کیوں ذکیہ نے اپنے دونوں ہاتھ سینے پر باندھ لیے' اور قدسیہ اپنے ننھے ننھے گھنگریالے بال سمیٹتی بے تابی سے اٹھ کر بیٹھ گئی ———— چاند درختوں کی اوٹ سے نکل کر اب اوپر آچکا تھا۔ رات کے پرند' وہ بہ وہ کر چہچہا رہے تھے۔ اور آوارہ کتا' سنسان سڑک پر وقفے وقفے سے روئے چلا جا رہا تھا۔ بھابی کی بڑی بڑی آنکھیں آسمان کی طرف اٹھی ہوئی ہوئی تھیں۔ جیسے وہ ایک خواب دیکھ رہی ہوں کہ چاندنی سے چمکتے ہوئے نیلے آسمان سے فرشتے' محبت و وفا کی بوریاں اپنی پشتوں پر لادے' دھم سے نیچے کودنے کے لیے پر تول رہے ہیں اور اس کے تے اپنے سرخ سرخ دانت صاف کر ڈالے ہیں۔ ہونٹوں پر پہلے کی طرح لالی ملی ہے اور اپنا بڑا سا پاندان اٹھا کر ذکیہ کے منہ پر دے مارا ہے۔ اتنی زور سے کہ ذکیہ کا چہرہ لہو لہان ہو گیا ہے۔ اور اس لہو لہان چہرے کو دیکھ کر زور زور سے ہنس رہی ہے۔ مگر خواب کی عمر ہی کتنی؟ بھابی کی نظریں مایوسی سے لوٹ آئیں آسمان پر تو صرف چاند تھا۔ اور اس کی روشنی میں مدھم ہوتے ہوئے اکا دکا تارے اور ہر طرف چھائی ہوئی خاموشی۔

"کیا سوچ رہی ہو بھابی؟"———— قدسیہ نے اداس خاموشی میں روح کو گھٹتے محسوس کر کے بھابی کا سہارا لیا۔

"کچھ نہیں۔"

"تو پھر کچھ باتیں کرو، جی گھٹا جاتا ہے۔"

جی ری گھوٹنے سے کیا ہوگا؟ کسی کا کیا جائے گا؟ بس تم بھی چوٹ پر شادی کر لو"
بھابی کی آواز انتقام پکار رہی تھی۔

"ایک مرد کی بے وفائی کے بعد پھر ایک مرد سے شادی کر لوں؟" قدسیہ جیسے کنوئیں سے بولی۔

"نہیں! میرے اس پلے سے کر لو قدسی" —— ذکیہ نے ایڑی سے ٹھوکا دے کر سوئے ہوئے پلے کو جگا دیا۔

تم سے کون بات کر رہا ہے۔؟ —— بڑی بیچاری! ان کے پلے سے شادی کر لوں جیسے اب مجھے مرد جڑے گا ہی نہیں، مگر یہاں کون کمبخت شادی ہی کر رہا ہے۔" قدسیہ کی آواز بھرا رہی تھی۔ اور جاگا ہوا پلا، کوں کوں کر کے پنجوں میں منہ چھپا رہا تھا۔

"نہیں، نہیں، میں نے تو تمہیں ایک مشورہ دیا تھا۔ کتا انسان سے زیادہ وفادار ہوتا ہے۔ اور پھر مزے سے زندگی کٹ جانے کا پورا پورا یقین۔ تم جانو کہ مہذب ممالک کی عورتوں نے کتے کو وفادار ثابت کرنے میں کس قدر ہاتھ بٹایا ہے۔ لیکن کون کہے کمبخت دنیا کو کہ بیچاریاں اس وفاداری کو ثابت کرنے کے سلسلے میں عدالت میں بھی کھینچی جاتی ہیں۔ مہر کے جھگڑوں کی طرح" —— ذکیہ نے ایک تلخ قہقہہ لگایا۔

"سچ ہے کتا مرد سے زیادہ وفادار ہوتا ہے۔" مرد کی مخالفت میں بولنے

والی شدت پسند بھابی نے کہا، اور ذکیہ مضحکہ خیز طریقے پر ہی ہی کرکے ہنس پڑی۔

"لیکن سب انسان برابر نہیں ہوتے" قدسیہ نے کہا۔

"ہاں ہمیں زندہ رہنے کے لیے یہی سوچنا چاہیئے" ذکیہ نے ایک طویل سانس لے کر زور زور سے پاؤں ہلانے لگی۔

"ہُنھ"! —— قدسیہ کی ہُنھ کہہ رہی تھی۔ کہ اس نے زندگی کے کتنے دن دیکھے ہیں۔ کتنے سہانے خواب اس پر طاری ہو رہے ہیں۔ جو وہ یہ سب کچھ سوچ لے؟ لیکن بھابی کچھ سوچنے لگی تھی اس کی ٹھوڑی گھٹنے پر ٹک گئی تھی۔ اور اس کی ایک انگلی بستر کی سفید چادر پر چکر کی طرح گھوم رہی تھی —— پھر ایک دم ویران خاموشی چھانے لگی تھی۔ قدسیہ کو اپنا دم گھٹتا ہوا سا محسوس ہونے لگا وہ جو ناکامی اور احساسِ ذلت کو مٹانے کے لیے جلد از جلد مر جانا چاہتی تھی جانے کیوں، ویرانی کے میدان میں ایک دوڑ بھی نہ لگا سکتی تھی۔ کو سننے والا اپنے کو ہاتھ پھیلا پھیلا کو کوس لیا کرتا ہے۔ اللہ کرے میں مر جاؤں، اے خدا سوا گھڑی کی موت دے دے، مجھے اب زندگی نہیں چاہیئے، اور پھر موت کا انتظار کرتا رہتا ہے۔ لیکن زندگی سے جلد از چھٹکارا حاصل کرنے کے لیئے اسے دو تولہ افیون یا چھت سے سڑک کی طرف ایک چھلانگ، کبھی یاد نہیں آتی اور قدسیہ بھی شاید باتیں ہی کرتے کرتے مر جانا چاہتی تھی۔ لیکن ذکیہ کی باتیں، تو موت سے بھی زیادہ وحشتناک معلوم ہوتی تھیں۔ قدسیہ نے گھٹے گھٹے جی سے آنکھیں بند کر لیں۔ اور اس کی گردن اس طرح تکیئے پر ڈھلک گئی، جیسے وہ مر گئی ہو، مگر وہ مری نہ تھی اس کی روح نے

بظاہر اس کے تبسم کو چھوڑ دیا تھا۔ اور بیتے ہوئے دنوں کو لوٹانے کے لیۓ بھاگ
گئی تھی اگر تی پڑتی بس بڑھتی ہی چلی جا رہی تھی۔ کالج۔ کالج کا لان، جہاں
سے ان دونوں کا ساتھ ہوا کرتا۔ دونوں ساتھ ہی کلاس میں داخل ہوتے، برابر کی
کرسیوں پر بیٹھتے۔ کتابیں سامنے کھلی پڑی رہتیں، لیکچر ہوتا رہتا اور وہ دنیا سے بے طرف
سے غافل، ایک دوسرے کو پیار بھری نظروں سے دیکھتے رہتے ——— وہ باغ
جہاں اس نے اپنی سہیلیوں سے ملنے کے بہانے کئی شامیں گذاری تھیں۔ اس کے
ساتھ ——— جہاں گلاب کے سرخ، گلابی اور زرد پھول، کانٹوں بھری
شاخوں پر جھولا جھولا کرتے، جہاں پام کے درختوں کے پتے، جیسے پنکھ پھیلائے
بس اڑنے کے لیۓ تیار رہتے۔ جہاں وہ ٹہلتے ہوئے جوڑوں اور تنہا لوگوں کی
نظروں سے بچ کر انگ ٹھنگ اس کے ساتھ بیٹھ جاتی تھی۔ اور پھر وہ دونوں جانے کتنی
بہت سی ارمان بھری باتیں کہہ ڈالتے تھے ——— دھڑکتے ہوئے دلوں اور اوبھی
اوبھی سانسوں کے درمیان ——— اور پھر جب شام کی سونلاہٹ رات
کو لبادہ اٹھانے کے لیے بڑھنے لگتی۔ تو وہ اس کے مضبوط شانوں پر سر رکھتے ہوئے
ایک دم گھر جانے کے لئے اٹھ کھڑی ہوتی ——— اور وہ اسے تانگہ اسٹینڈ تک
چھوڑ کر بجلی کے کھمبے کا سہارا لے کر کھڑا ہو جاتا۔ وہ اسے اس وقت تک کھڑا ہوا دیکھتی
رہتی، جب تک کہ تانگہ ایک موڑ پہ جا کر اس کی نظروں سے اوجھل نہ کر دیتا — اور
وہ دن جب کہ اس کی ان کی محبت کو ان کے دلوں سے چرا کر، کالج کے لڑکوں اور
لڑکیوں نے اپنی زبانوں پر چڑھا لیا تھا۔ وہ ہر طرف بدنام ہو رہی تھی۔ لڑکے اور
لڑکیاں اسے دیکھ کر فقرے کستے، معنی خیز ہنسی ہنستی تو وہ رنجیدہ ہو ہو جاتی اس

وقت وہ بڑی بائیانہ شان سے آگے بڑھتا، اور سب کے سامنے اس کا چھوٹا
سا ہاتھ تھام کر، کالج کی حدوں کو پار کرتا ہوا، باہر سڑک پر آجاتا اور پھر اس سے
اتنی اچھی اچھی باتیں کرتا کہ وہ اپنا سارا رنج بھول جاتی۔ اس کا جی چاہنے لگتا کہ
وہ اپنے پیارے بائی کے گلے میں باہیں ڈال دے مگر وہ اپنا جی گھونٹے، اس
کے ساتھ ساتھ چلتی رہتی ـــ اور پھر وہ امید بر آنے والا دن جب اس نے اس
کے بھیا کو شادی کا پیغام دیا تھا۔ اور اس کے بھیا نے تھوڑی سی نہیں کے بعد قبول
کرلیا تھا۔ دونوں کی امیدوں کے بالکل برعکس ـــ اس دن وہ کتنی خوش
ہوئی تھی۔ اس نے مارے خوشی کے بھابھی کے گلے میں باہیں ڈال دی تھیں
بھابھی کے ہونٹ چوم لئے تھے، اور مارے شرم کے اپنے کمرے میں بھاگ گئی
تھی، اور پھر نرم بستر پہ لیٹ کر جانے کیا کیا سوچتی رہتی تھی کہ بار بار اس کے
ہونٹوں پر ایک معصوم پر اسرار مسکراہٹ کھیلنے لگتی۔ سارا بدن ہلکا سا جلنے لگا تھا
اور آنکھیں اتنی بوجھل ہوگئی تھیں کہ جب بھی وہ آنکھیں کھولتی تو خود بخود مند جاتیں
اس دن بھی ذکیہ کی خاموشی ٹوٹی تھی۔ لیکن اسے ذکیہ پر ذرا بھی غصہ نہ آیا تھا۔
اسے اس دن ذکیہ پر رحم آیا تھا، ایسا رحم، جو سر راہ بیٹھے ہوئے اپاہج بھکاری کو
بھیک دیتے وقت دل میں پیدا ہو۔ صرف چند لمحوں کے لئے اور پیٹھ موڑتے
ہی وہ رحم معدوم ہو جائے۔ جیسے پاؤں تلے آنے والی چیونٹی ـــ اور پھر انتظار کے
وہ دن جب کالج بند ہونے کے کچھ دن بعد اچانک خطوط آنے کا سلسلہ منقطع ہو
گیا تھا۔ اور وہ جیسے انتظار کی افیون کھائے سارا سارا دن اونگھا کرتی۔ چونکتی
تو صرف ڈاکئے کی آواز پر۔ ـــ بھابھی بھیا اور ذکیہ سبھی کے خطوط آتے۔ مگر اس

کے نام کا خط نہ ہوتا ۔ وہ دیر تک تکیئے میں منہ چھپا کر روتی اور طویل طویل شکایتی خطوط لکھتی، اور پھر جواب کا انتظار کرنے لگتی ۔ اور آخر کا اس کا انتظار بھی ختم ہو گیا ۔ ایک دن ـــــ بیتے ہوئے دنوں کو لوٹانے کے لئے بھاگی ہوئی روح تھکی ماندی، منہ بسورتی آگئی تھی ۔ ایک خط لئے ہوئے ۔ جس میں شادی اور بربادی دونوں کی خبر تھی اور بس ـــــ اس کی روح، ماضی کا ایک بھی نورنگین دن واپس نہ لا سکی تھی ـــــ ماضی کے دن ـــــ آندھی کے تیز جھکڑوں سے اکھڑ کر گرنے والے تناور درخت پھر سے نہیں اگا کرتے ـــــ قدسیہ کی آنکھوں نے بہت سے جلتے جلتے آنسو اگل دیئے ۔ اور کئی آہیں ۔ اس کے لبوں سے نکل گئیں ۔

پھر رو رہی ہو، کیوں آنکھیں پھوڑ رہی ہو ۔ اس کمینے کے لئے ؟ قدسیہ کی آہوں اور ناک کی سوں سوں نے بھابھی کو بتا دیا کہ وہ رو رہی ہے ۔

اللہ قسم، بھابھی جیسے یقین نہیں آتا کہ وہ بدل گیا" قدسیہ نے بھابھی کی طرف کروٹ بدل لی ۔

"ہاں ! یوں ہی بدل جاتے ہیں سب یقین کر دچاہے نہ کرو" بھابھی کے لہجے سے معلوم ہو رہا تھا کہ اگر اسے وہ چکی مل جائے جس میں انسان پیسے جاتے ہیں تو وہ ساری دنیا کے مردوں کو پیس کر رکھ دے ۔

سب کمینے ہوتے ہیں ۔ سب ذلیل ہوتے ہیں " بھابھی آہستہ سے بڑبڑائی

"اُف ! وہ ارمان بھری باتیں، وہ عمر بھر کا ساتھ دینے کا وعدہ، اُفوہ کتنی عجیب باتیں کرتا تھا ۔ وہ کاش اس وقت مجھے اس کی باتوں پر یقین نہ آتا، قدسیہ نے

نکل جانے کے بعد لکیر پیٹ رہی تھی ۔ اس نے آنکھوں میں تیرتے ہوئے آنسو پونچھ
کر، دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا ۔

ہی ——— ہی ہی ۔ ذکیہ ہنستے ہوئے کہنے لگی ——— یقین آتا کیوں نہیں ، پھر ایسی
حالت میں جب کہ عورت مرد کے معاملہ میں اپنے کانوں سے تین کام لیتی ہے ۔
سننا، تمست کرنا اور سوچنا ——— ہی ہی ———" ذکیہ نے پھر ایک مضحکہ خیز قہقہہ
لگایا ——— اور قدسیہ کو ایسا محسوس ہوا کہ جیسے اس کے سر پر گرم پانی کی بوتل رکھ
دی گئی ہو ۔ لیکن وہ اپنے غصہ کو برداشت کئے گھٹی سی چُپ بیٹھی رہی اور ذکیہ
کی طرف سے بڑھتی ہوئی بیزاری کو ہاتھ مل مل کر دبا رہی تھی ۔ اور بھابھی کی ٹھوڑی
گھٹنے پر جھک گئی تھی اور وہ اپنی انگلیاں ماتھے پر گھس گھس کر شاید بعد از وقت
کچھ سوچنے کی کوشش کر رہی تھی ۔ لیکن ریتیلے میدان میں پیدل چلنے والا راہی کسی
تیز اونٹنی سوار کے پیچھے بھاگ کر ساتھ ہونے کی کوشش کرے تو کیا پائے گا ؟ ریت کی
مٹھی بھر پھنکیاں اور ریت میں دھنستے ہوئے پاؤں ——— ؟

پاگل کی بڑ سے بھلا کیا دکھ ہو گا کسی کو" ——— قدسیہ کی بیزاری حد سے
بڑھ رہی تھی ۔ بھابھی نے پہلو بدل کر ذکیہ کی طرف منہ کر لیا شاید وہ یہ دیکھ رہی تھی کہ
چھوٹی بہن کی گستاخی پر ذکیہ اٹھ کر کب اس کی مرمت کرتی ہے ؟ لیکن ذکیہ نہ تو اٹھی اور
نہ کچھ جواب دیا ۔ وہ اسی طرح پڑی پاؤں ہلا رہی تھی ۔ اس کی چھوٹی چھوٹی کٹیلی
آنکھوں میں ذرا بھی غصہ نہ تھا ، وہ اسی طرح بے بس سوچ رہی تھی اور سامنے دور کچھ
گھور رہی تھی ۔ شاید مولوی جی کے اجاڑ باغ کے وہ تینوں ہوا میں لڑتے جھگڑتے
درخت ——— قدسیہ نے ذکیہ کو خاموش پا کر اطمینان کی سانس لی ——— وہ بالکل

نہ چاہتی تھی کہ ذکیہ اس کی گفتگو کے درمیان ایک لفظ بھی بولے یا ہوں ہی کرے۔ ذکیہ
کی باتیں تو اسے ایسی لگتیں کہ جیسے وہ بھر بھر مٹھی دھول اس کی طرف اچھال رہی ہے
اور اس کے دانت کرکرا کے جاتے ہیں۔ اور جب دانت کرکرا ئیں گے تو کس کا جی
نہ چاہے گا کہ کلی کر ڈالے۔ اب وہ صرف بھابھی سے باتیں کرنے کی سوچ رہی تھی
مردوں کے ظلم و ستم پر اور عورتوں کی مظلومیت پہ اور پھر بھابھی کے ہمدردی کے
بول، بھیک کے پیسوں کی طرح سمیٹ کر اپنے ذلت سے روتے ہوئے دل
کو تھوڑی سی تسلی دے لینا چاہتی تھی۔ اب وہ مرنے اور رونے سے دور ہٹ
کر اور بھی بہت کچھ سوچ رہی تھی۔ بدنامی اور مستقبل کی تباہی دونوں کی محبت مشہور
ہو چکی تھی۔ دونوں کی شادی نہ ہونے کی خبر عام ہو چکی تھی۔ پھر بھلا شادی نہ ہونے کی
خبر کب چھپے؟ اور لوگ ایسے وقتوں میں نہ جانے کیا کیا سوچنے لگتے ہیں۔ تھالی
لوٹے، چاہے نہ لوٹے، لیکن اس کے گرنے کی جھنکار سننے والے یہی سمجھتے
ہیں کہ تھالی لوٹ گئی۔

"بھابھی اب کیا ہوگا؟" قدسیہ نے سوچتے سوچتے گھبرا کر پوچھا۔

"ہوگا؟" —— ذکیہ تڑپ سے بولی —— "آسیب زدہ مکانوں کی طرح
خالی پڑی رہو گی۔ شاید کوئی بھولا بھٹکا پردیسی آ بسے، لیکن جب اس کو بھی
آسیب کے لئے معلوم ہوگا تو بھاگ کر نہ جا سکا تو پھر آسیب کا خوف تو ہر وقت
رہے گا دل میں"۔ ذکیہ طنز سے ہنسی اور قدسیہ اس بری طرح سے حقیقت پر
تلملا کر رہ گئی۔ لیکن جوانی اور حسن بھی اس کے ساتھ تھا تڑپ کر بولی۔
لیکن جب کوئی پردیسی اس مکان میں آ بسا تو تمہارے منہ میں خاک پڑے

جائے گی۔"

"نہیں نہیں! مجھے بہت خوشی ہو گی۔" — ذکیہ جیسے دو سال کے بچے سے مخاطب ہو۔

"ہوں"! — قدسیہ نے اس طرح "ہوں" کی جیسے وہ کہہ رہی ہو کہ میں تم جیسوں کو خوب جانتی ہوں۔

اور اب تمہیں اور اس کمینے کو دکھا دوں گی۔ شادی کر کے"۔ قدسیہ جوش سے کہنے لگی۔ اور پھر تم بھی سن لینا کہ اس شادی سے اس کے دل پر کیسے چرکے لگتے ہیں۔"

"اُف! — عورت — کہنی کی چوٹ — بس ذرا سا جھن سے ہوا۔ اور کچھ بھی نہیں۔ یہ چرکے ورکے تم اپنی محدود دنیا میں پڑے پڑے سوچا کرو۔ لیکن تم بیچاری کی بھی کیا خطا۔ تمہارے نظام نے ہماری دنیا کو مرد کی محبت اور نفرت کے دائرے میں جو قید کر رکھا ہے۔" ذکیہ نے ایک لمبی سانس لی۔ اور اس کی کھوکھلی ہنسی خاموش فضا میں تیر گئی — قدسیہ کو محسوس ہوا کہ اس کے دانتوں کے نیچے جیسے ریت کے ذرے کرکرا رہے ہیں۔ بھابی جو دیر سے چپ اور بے سدھ سی بیٹھی تھی۔ اپنی انگشت شہادت سے کہنی کی ہڈی پر ٹک ٹک کر رہی تھی۔ سڑک پر آوارہ کتا پھر رو رہا تھا۔

"ہاں، عورت، مرد کے لیے کہنی کی چوٹ ہے۔" بھابی جیسے خواب میں بڑبڑائی اور قدسیہ نے بے بسی سے اپنے گرد و پیش دیکھا۔ بیچاری قدسیہ، ذکیہ کی سی ہمدردی کی بھیک بھی نہ بٹور سکتی تھی۔ اور ذکیہ کا اس پہ پٹتا ہوا احساس ذلت بار بار

اس کے کانوں کی طرف لپک رہا تھا۔ تدسیہ کا جی چاہنے لگا کہ وہ خوب رو دے چیخ چیخ کر، لیکن وہ یونہی گھٹی گھٹی سی بیٹھی رہی اور ذکیہ کی طرف سے اس کی بیزاری بڑھتی گئی۔

کہیں قریب کے گھنٹہ گھر سے بارہ کا گجر بجنے کی آواز آئی۔ سڑک پر کوئی یکہ شاید سنیما کے آخری شو دیکھنے والوں کو بٹھلائے ہوئے گزرا اور پہیوں کی گڑگڑاہٹ کے ساتھ "آواز دے کہاں ہے؟ دنیا مری جواں ہے!" کی ایک بھدی تان سڑک کی خاموشی کو چیرتی ہوئی، آہستہ آہستہ گم ہوگئی۔

"اب تو ہمارے حضور بارہ بارہ بجے تک غائب رہنے لگے ہیں" بھابھی کی آواز میں یاس کے علاوہ کچھ بھی نہ تھا۔

جب کوئی یہ جانتا ہو کہ گھر میں وہی، ارہر کی دال پکی دھری ہوگی تو باہر کا قورمہ کیا برا ہے؟ کوئی کیوں پہنچے وقت سے گھر"؟ ذکیہ نے آہستہ سے کہا اور انگلیاں چٹخانے لگی۔

"بہت خوب! تو میں ارہر کی دال ہوں"؟ بھابھی کے لہجے میں ان کی تعلیم اور حسن کا غرور انگڑائی لے رہا تھا۔

"پھر اور کیا ہو"؟ ذکیہ اپنے بستر پر بیٹھتے ہوئے کہنے لگی —— تم آج آٹھ سال سے ایک ہی روپ میں، ایک ہی انداز میں، بھیا کے سر پر سوار ہو، وہ بھی اس شان سے کہ بارہ ہزار روپے مہر کی دھونس اور چھ بچوں کی پرورش کا غرور لئے ہوئے تم ہر جائز و ناجائز مطالبہ کرتی رہتی ہو اور بھیا بھی جانتے ہیں کہ اگر پالتو قمری کے پنجرے کی کھڑکی کھول دی جائے تو وہ اڑ نہیں سکتی۔ اس کے پروں کے نیچے ننھے

بچے کپکپا رہے ہیں۔ پنجرے سے باہر کی دنیا میں غلیل کے غلّے" ذکیہ نے اپنی دونوں ہتھیلیاں رگڑ ڈالیں۔ جیسے وہ بہت بے چین ہو۔

ذکیہ تم مجھے قمری اور پنجرے کے چکر میں نہیں الجھا سکیں اور نہ تمہاری یہ تقریر جیسی باتیں مجھے دھولنس میں لا سکتی ہیں۔ تم آج اچھی طرح یہ بتا دو کہ میں نے تمہارے بھیّا سے کون سے مطالبات ناجائز کئے ہیں؟ یہی نا کہ ان کے ہر حکم پر سر جھکایا۔ اور جاہل عورتوں کی طرح ان کے ساتھ ساتھ تم سب کی بھی خدمت کی لیکن سچ کہا ہے کسی نے کہ پانی نشیب ہی میں مرتا ہے۔ تم لوگوں سے محبت کرنے کا یہی بدلہ ملنا چاہیے۔ بھابی کی آواز بھرا رہی تھی۔

لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہ ہماری بہن صاحبہ نے کون سا جائز مطالبہ کیا تھا جو شادی کے ایک ہی سال بعد، کان کھڑکھڑا کر ملکے پہنچ دی گئیں۔ تاکہ سب کے مطالبوں کو ناجائز قرار دیتی رہیں۔" قدسیہ نے جوش سے کہا اور ذکیہ تلخی سے ہنسی۔

تم کیا کہتی ہو قدسیہ؟ شراب کی دو بھری بوتلیں۔ ایک کو خالی کر کے الماری یا میز پر پٹخ دیا گیا۔ اور شراب کی دوسری بھری بوتل، جس کا کاک اڑانے سے پہلے ہی پینے والے نے توبہ کر لی ——— ہی، ہی، کیا قیمت رہی اس شراب کی؟ ——— ذرا تو سوچو، اپنے لئے قدسیہ ذکیہ نے اس پاگل جیسا قہقہہ لگایا جو دنیا کی بے ثباتی سے متاثر ہو کر پاگل ہو گیا ہو۔

"اُفوہ بہ" قدسیہ۔ اپنے پلنگ سے ایک دم کھڑی ہو گئی۔ لپکتے ہوئے احساسِ ذلت سے بڑھ کر اس نے کان مروڑ دیئے۔ شراب کی ایک بھدی

ہوئی بوتل، اس کی نظروں میں لڑھکتی ہوئی محسوس ہونے لگی۔ اور توبہ کرنے والے کا مسکراتا ہوا چہرہ اسے منہ چڑا چڑا کر جیسے ہر طرف تیرنے لگا ——
قدسیہ اپنا منہ چھپا کر دھم سے پلنگ پر گر کر بلکنے لگی۔ ذکیہ کے ہلتے ہوتے پاؤں ایک پلے کو رک کر پھر زور زور سے ہلنے لگے۔ بھابی اپنے دونوں ہاتھ بستر پر رگڑتے ہوئے کسمسائی۔

"تم بھی اٹھو، وفادار رو رہے ہیں اور تم سو رہے تھے" —— پائینتی سوتے ہوئے پلے کو ذکیہ نے ایک ٹھوکا دیا۔ اور اپنی غم سے دھندلائی ہوئی آنکھیں ہتھیلیوں سے رگڑنے لگی۔ جاگا ہوا پلا، کوں کوں کر رہا تھا۔

"ہائے اللہ! تو مجھے موت دے دے یا پھر آپا کو اٹھا لے" قدسیہ نے روتے ہوئے دردناک آوازیں کر سا۔

"ایسا نہیں کہتے، قدسیہ —— بھابی کہنے لگی —— "لیکن ذکیہ تم بہن ہو کر بیرن" بھابی کی آواز نفرت کے بوجھ سے کانپ رہی تھی۔

"بیرن —؟ نہیں —— بہن ہی کہے جائیں گے —— ذکیہ پھر اپنے بستر پر بیٹھ گئی —— تم نہیں جانتیں بھابی کہ ساری دنیا کے انسان بھائی بھائی کہے جاتے ہیں۔ لیکن پھر بھائیوں نے ایٹم بم ایجاد کیا۔ مشین گنیں چلائیں، بندوقیں پھٹپھٹائیں، چھریاں چاقو لہرائے۔ پتھر اچھالے، قحط ڈالا۔ اور چاول کے ایک ایک دانے پر عصمتیں لوٹیں۔ کیا یہ سب کچھ بھائیوں نے چوہوں۔ چوہیوں کے لئے کیا تھا۔ اور کر رہے ہیں۔ اور کیا اب بھی یہ نہیں کہا جاتا کہ سب بھائی بھائی ہیں؟" ذکیہ نے اپنے سرہانے سے ملائم تکیہ اٹھا کر اپنے سینے میں بھینچ لیا۔

"اور تم بھی انہیں سے متاثر ہو، کیوں نا بی ذکیہ؟" بھابی نے اپنے حساب طنز کا بوجھل لبادہ ذکیہ پر ڈال دیا۔

"ہاں! ہم، تم اور سب اسی دنیا میں رہتے ہیں۔" ذکیہ اپنے بستر پر اس طرح اوندھی لیٹ گئی۔ جیسے گر پڑی ہو کھڑے سے۔ بھابی نے اپنا سر گھٹنے پر ٹیک دیا۔ اور پھر کئی لمبی لمبی آہیں۔ اس کے لبوں کی قید سے آزاد ہو گئیں۔

رات جیسے وہ بھی ویران ہو گئی تھی۔ مولوی حسن کے اجاڑ باغ کا شب بیدار الّو، زور زور سے چیخ اٹھا اور خود بخود رونے اور چپ ہونے والا آوارہ کتا ایک بار پھر رو کر چپ ہو گیا۔ رات کے پرندوں کا ایک غول اپنے پروں کا سناٹا بکھیرتا چھت پر سے گذر گیا۔ اور بھابی کا جھکا ہوا سر ایک لمحے کو اٹھ کر پھر جھک گیا۔ اس کی آنکھوں سے موٹے موٹے آنسو بہ رہے تھے۔ قدسیہ کے آہستہ آہستہ رونے کی آواز اور بھی دردناک ہو گئی تھی۔ اور ذکیہ اسی طرح بے سدھ اوندھی پڑی تھی۔

"مت رو، قدسیہ! میری جان، اُف ————" ذکیہ اوندھے پڑے پڑے بولی۔ اس کی آواز سے کرب جھانک رہا تھا۔ قدسیہ ایک دم حیران سی ہو کر چپ ہو گئی۔ قدسیہ نے اس بہن سے محبت کے بول سنے تھے جو ایک سال سے سب کے لیے آزار کا سامان بنی ہوئی تھی۔ جو طنز کا ایک ایسا پلندہ تھا جس کی سب گرہیں کھلی تھیں۔ جس کی زبان سے کسی نے محبت کا ایک بول نہ سنا تھا وہ آج کتنے کرب سے، کتنی محبت سے اسے رونے سے منع کر رہی تھی اور شکستہ دل قدسیہ اس محبت پر پھوٹ پھوٹ کر رونے کی بجائے، حیران

سی ہو کر اسے ٹک ٹک دیکھنے لگی تھی۔

جانے کیا سمجھتے ہو تم لوگ مجھے ——— ذکیہ آنسوؤں میں ڈوبی ہوئی آواز سے کہہ رہی تھی۔ مگر مجھے تم سب سے محبت ہے۔ میں دشمن نہیں؟"

قدسیہ کا جی چاہا کہ وہ اٹھ کر اوندھی پڑی ہوئی ذکیہ کے لپیٹ جائے، اس کے سینے پر اپنا سر رکھ دے۔ اور پھر اتنا روئے کہ ذکیہ کا سارا سینہ تر کر دے۔ لیکن ایک سال سے دونوں کے درمیان برتی ہوئی غیریت کی دیوار حائل ہو گئی۔ قدسیہ گھٹی گھٹی سی اپنی جگہ پر بیٹھی رہی۔ ذکیہ اسی طرح اوندھی پڑی رہی جانے کیوں؟ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ کر ملائم تکیے میں جذب ہوتے چلے جا رہے تھے۔ بالکل اسی طرح جیسے کچی چھتوں میں بارش کے قطرے۔

آپا قدسیہ نے آواز دی، لیکن ذکیہ چپ چاپ پڑی رہی۔ قدسیہ کے پکارنے پر ایک اسے موہوم سی جنبش بھی نہ ہوئی۔ اس کی ایک تیز سانس بھی نہ سنائی دی۔ بس وہ چپکے چپکے رو رہی تھی۔ پورے ایک سال پہلے جب ذکیہ کی طلاق، صرف اس بات پر ہو گئی تھی۔ کہ وہ اپنے شوہر کی شریک زندگی نہیں۔ رفیقِ زندگی بن کر رہنا چاہتی تھی۔ اور اس کے شوہر کو گھر کی چار دیواری میں رفیقِ زندگی کی قطعی ضرورت نہ تھی۔ تو اس دن ذکیہ اپنی بھابی کے گلے میں ہاتھ ڈال کر خوب روئی تھی۔ پھر اس کے بعد اسے کسی نے بھی روتے نہ دیکھا تھا۔ اس کی آنکھیں، دودھ کے اس برتن کی طرح خشک رہتیں، جسے بلی نے اچھی طرح چاٹا ہو۔ اور اس سے ملنے والوں کا خیال تھا کہ وہ عورت ہی نہیں ہے وہ کچھ اور ہی ہے جو نہ اپنی طلاق کا ذکر کر کے روتی ہے۔ نہ کسی سے

ہمدردی کے دو بول سننا پسند کرتی ہے لیکن آج وہ پھر رو رہی تھی، سب سے چھپ کر۔ اور کون جانے کہ وہ ہمدردی کے دو بول سننے کے لیے بھی تڑپ رہی ہو؟۔

آپا کیا بات ہے؛ یوں کیوں پڑی ہو؟" قدسیہ نے پوچھا، ذکیہ کو پڑے دیکھ کر اس کا جی کُل رہا تھا۔ بھابی نے اداس اداس نظروں سے ذکیہ کو دیکھتے ہوئے ایک لمبی آہ بھری اور پھر پاندان اپنی طرف کھینچ کر ڈلی کاٹنے لگی۔

"بس کوئی بات نہیں، یوں ہی تمہارے متعلق سوچنے لگی تھی۔ کتنی جلدی تم بھی ہمارے ساتھ آملی ہو۔ میرا خیال تھا کہ کچھ دن تو ایسے ضرور گزریں گے۔ کہ تم اپنے اوپر ناز کر سکو۔ اور میں نے کتنی دعائیں کی تھیں۔ تمہارے لیے" ذکیہ اپنے آنسوؤں پر قابو پاتے ہوئے صاف آواز میں بولی۔

شاید وہ آج بھی اپنے دکھوں کا ذکر نہ کرنا چاہتی تھی۔

"سچ آپا کیا تم اتنی مہربان تھیں" قدسیہ کو شک ہو رہا تھا۔

"پتہ نہیں" ذکیہ طنز سے ہنسی۔

"مگر بتاؤ نا آپا میں اب کروں گی کیا" قدسیہ پھر اپنے متعلق سوچ رہی تھی۔

کیا کرو گی قدسی پیاری، بس یہی ہو سکتا ہے۔ کہ تم دوسری شادی کر لو۔ اور اپنے شوہر کو یقین دلانا کہ تم اس سے قطعی محبت نہ کرتی تھیں اس نے خود ہی تمہارے لیے ہزاروں بار اپنا گریبان چاک کیا تھا مجبوراً شادی کے لیے

تیار ہوئیں۔ لیکن پھر عین وقت پر انکار کر دیا۔

"آپا کیا تم پھر طنز کر رہی ہو۔" قدسیہ نے بری بری نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"کیا میرا لہجہ اتنا خراب ہو چکا ہے" ذکیہ ٹھنڈی سانس بھر کر انگلیاں مروڑنے لگی۔

"نہیں میں نے ویسے ہی پوچھا تھا" قدسیہ نے سر جھکا دیا۔

"کیا وقت ہوگا ذکی؟" بھابی کچھ سوچتے سوچتے چونکی۔

"بس جس وقت تک بھیا نہ آئیں یوں سمجھ لو کہ بارہ نہیں بجے۔"

"ہاں!" بھابی دوسرا پان بنانے لگی ــــ ساری زندگی انتظار میں گزر گئی۔"

"بھابی شکر ادا کرو کہ بھیا آتے تو ہیں۔ مجھ سے پوچھو۔ مجھے تو کسی کا انتظار نہیں کبھی کبھی جی چاہتا ہے۔ کہ ہونٹوں پر لالی لگا لوں۔ اجمڑے ہوئے بال سنوار لوں۔" وہ بڑی بے بسی سے کھلکھلا کر ہنسی اور پھر اس کے ہونٹ مضبوطی سے بھنچ گئے۔

"کیا سچ ذکی!" بھابی نے اشتیاق سے پوچھا۔

"ارے کوئی میرا دماغ بھی خراب ہے۔ جو انتظار کروں گی۔

ذکیہ کے لہجے میں وہی پرانا طنز تھا!

"تو کیا میرا دماغ بھی خراب ہے۔ بچھو بھلا ڈنک مارے بغیر رہ سکتا ہے" بھابی بلک کر رو دی۔ ذکیہ نے

اپنا منہ تکیوں میں چھپا لیا۔

ذکیہ بھرائی آواز میں بولی۔

میں بچھو نہیں ہوں۔ کوئی انسان بچھو نہیں ہو سکتا ——— اور پھر وہ جیسے تقریر کرنے لگی ——— یہ آسمان بدل جائے۔ یہ نظام تباہ ہو جائے۔ پھر کوئی ذکیہ طلاق پر خود کو بچھو نہ ثابت کرے گی۔ اور کوئی قدسیہ محبت کی ناکامی پر بدنامی کے خوف سے نہ کلپے گی۔ اور کوئی بھابی ڈگری رکھتے ہوئے صرف بچوں کی پیدائش کا ٹھیکہ نہ لے گی، اور پھر کوئی ———

"سور ہو آپا تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔" قدسیہ نے بڑی ہمدردی سے کہا، اس کا خیال تھا کہ ذکیہ کا دماغ موٹی موٹی کتابوں اور طلاق دونوں نے خراب کر دیا ہے۔ یہ بہت جلد پاگل خانے کی سیر کرے گی۔

"ہاں سو رہو ذکی" بھابی نے بھی ہمدردی سے قدسیہ کی ہاں میں ہاں ملائی۔ ذکیہ ان ہمدردیوں پر زور سے ہنس پڑی۔

بھئی ذکی یوں پاؤں نہ ہلایا کرو۔ سچ منحوس ہوتا ہے۔" بھابی گھر میں پڑے پڑے اپنی جاہل دادی اور نانی کی باتیں دہرانے کی عادی ہو گئی تھی۔

" ارے میں تو اس لئے پاؤں ہلاتی ہوں۔ کہ شاید اس دنیا میں ایک ایسا زلزلہ آئے کہ ساری تباہ ہو کر رہ جائے۔ اور پھر جب نئی دنیا کے نئے انسان کی تخلیق ہو تو بندر کی فطرت سے نہیں۔ بلکہ کتے کی فطرت سے پھر ہماری بھابی راج کرے اور ہماری قدسیہ جب باہر نکلے تو اتنے عاشقوں

کا ہجوم ہو کر ٹریفک بند ہو جائے۔" ذکیہ دل کھول کر ہنس پڑی ——
بھابی اور قدسیہ بھی زور سے ہنسنے لگیں۔

نچلی منزل کے صدر دروازے کھولنے اور بند کرنے کی آواز آئی تو تینوں ایک دم چپ ہو گئیں۔ بھابی آج خلافِ معمول اپنے شوہر کے آنے پر پاندان بند کر کے چپ چاپ لیٹ گئی۔ ورنہ وہ اس وقت تک لیٹنا حرام سمجھتی جب تک اپنے شوہر سے رات گئے تک باہر رہنے پر ایک زوردار مورچہ نہ جمالے۔

زینے پر ہولے ہولے جوتوں کی چاپ ہو رہی تھی۔

"کتنے چپکے آرہے ہیں بھیا۔" ذکیہ نے آہستہ سے کہا۔

ہوں! بھابی نے بڑی نفرت انگیز "ہوں" کی۔

"بیچارے!" ذکیہ ہاتھ ملتے ہوئے آہستہ سے بڑبڑائی۔ شاید اس وقت اسے اپنے بھیا سے ہمدردی ہو رہی تھی۔ وہ بھیا جو پورے مہینے سخت محنت کرنے کے بعد صرف دو سو معاوضہ پاتا۔ اور پھر اپنی جان ان پسنا زل رہنے والے بارہ بھوتوں کو کھلاتا پلاتا۔ مگر ان کے پیٹ نہ بھرتے، ان کے تن نہ ڈھکتے۔ ہر ایک سمت ضرورت مند نظر آتا اور وہ ان کی ہر ضرورت کو پورا نہ کر پاتا۔ وہ تنہا کماتا مگر بیوی اور بہن سے ملازمت نہ کراتا۔ وہ یہ طعنے نہ سن سکتا تھا کہ بہن اور بیوی کی کمائی کھاتا ہے۔ وہ تنہا اپنی جان کھپاتا۔ پھر بیوی اس سے نفرت کرتی، بچے محبت سے ابا کہتے ہوئے گھبراتے۔ بہنیں اسے برا کہتیں کہ وہ اپنے بچوں کا زیادہ خیال رکھتا ہے۔

لیکن اب وہ سب سے بے نیاز رہ کر راتوں کو غائب رہتا، جیسے اسے اب کسی کی پرواہ نہ رہ گئی تھی۔ اس کا ایک ایک انداز کہتا تھا کہ اب تم مر بھی جاؤ تو مجھے پرواہ نہیں۔

بھیا اوپر آکر چھوٹے کمرے میں کپڑے تبدیل کر رہے تھے۔ ذکیہ بجھی بجھی نظروں سے ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔ اس کا چہرہ اس وقت عجیب سا ہو رہا تھا۔ سخت اور طنز سے بھرپور۔ وہ ایک دم پھر ذرا دیر پہلے کی ذکیہ لگ رہی تھی۔

"ارے بھئی کیا سب سوتے بن جاؤ گے۔ بھیا کو رنج نہ ہوگا کہ آج کوئی دنادار جاگ بھی نہیں رہا۔" ذکیہ نے اپنے مخصوص لہجے میں کہا۔ سخت ناشکرے ہو تم لوگ، کھانا اور بس اینڈ نا۔"

"ذکیہ پیاری اپنے کتے کے پلے کو جگا دو۔" بھابی نے آہستہ سے کہا۔

"اُف۔ فوہ!———— ذکیہ نے اپنی ہتھیلیاں رگڑ ڈالیں۔ بھیا کمرے سے باہر نکل رہے تھے۔ اس نے اس کمزور ڈھانچے کو بستر کی طرف بڑھتے دیکھا اور چپ چاپ لیٹ گئی۔ اس وقت اس کی آنکھوں میں بہت سے آنسو اُمنڈ رہے تھے———— میرا بھیا، میرا ڈھانچہ———— وہ آہستہ سے بدبداتی۔ لیکن قدسیہ ان سب باتوں سے بے نیاز لیٹی ساری کے باریک پلو میں سے وہ تینوں سر جوڑے ہوئے اونچے درخت دیکھ رہی تھی۔ جہاں زردی مائل اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ اور اس کا دل اپنی محبت کی ناکامی کی داستان دہرا رہا تھا۔

سنسان موڑ

آج رات اتنی خوبصورت تھی کہ ایسا لگتا کہ ساری دنیا کے محبت بھرے قصے کہانیاں اپنے دامن میں سمیٹ لائی ہے۔ اتنی حسین رات میں نیند کیسے آئے وہ اپنے بستر پر کسمساتے کسمساتے آخر اٹھ پڑی اور اپنے شوہر کے پلنگ کی پٹی سے ٹک کر آہستہ آہستہ اس کے شانوں پر ہاتھ پھیرنے لگی۔

بھئی مت سوؤ، ایک ذرا دیر جاگ لوگے تو کیا ہو جائے گا ——

وہ اپنے شوہر کو آہستہ آہستہ ہلانے لگی۔ میں سارا دن تو تمہارا انتظار کرتی ہوں اور تم آتے ہی سو جاتے ہو   اس کی آواز بھر آنے لگی   سارا دن جی گھبراتا ہے دیکھو نا رات کتنی خوبصورت ہے۔ مجھے تو نیند نہیں آ رہی۔ اٹھ جاؤ نا۔" اس نے اپنا سر آہستہ سے اس کے سینے پر رکھ دیا۔

"اوہ! تم بھی سو رہو" وہ نیند میں بڑبڑایا اور پھر کروٹ لے لی۔ اس کے چہرے پر تھکان اور دفتر کی فائلیں برس رہی تھیں۔

"ایک ذرا دیر کو اٹھ جاؤ نا، اچھا آنکھیں تو کھولو" اس کی آواز التجا کے بوجھ سے کانپ رہی تھی۔ اب کے اس نے اپنا سر اس کے شانوں پر زور سے پٹخ دیا۔

"اوہ! سونے دو، بہت تھکا ہوا ہوں" نیند خراب ہونے کی وجہ سے اس کی آواز میں جھلاہٹ تھی۔

"اچھا سوؤ!" وہ پست سی ہو کر اپنے بستر پر واپس آگئی۔ اس نے تڑپ کر اپنا سر تکیے میں رگڑا ——— "بھئی اب وہ ایک رات بھی نہیں جاگ سکتا" اس نے اس طرح ہلکی سی سسکی لی۔ جیسے ٹھنڈ لگ رہی ہو۔ مگر کون تھا جو اس کی سسکی کو اپنے سینے میں جذب کر لیتا۔ راتوں کو اس ننھی سی خواہش کو پورا کر دیتا۔ کوئی بھی تو نہیں، جسے دیکھو اپنی فکر میں مبتلا ہے کسی کی نیند پوری نہیں ہوئی کسی کے گھر میں دیا نہیں جلا، کسی کا پیٹ خالی ہے۔ اور کوئی بدہضمی کی غفلت میں بڑا اینڈ رہا ہے معصوم روحیں ہونٹوں پر لالی لگا کر محبت کے دو دو بولوں کو ترس رہی ہیں لیکن کسی کو پتہ بھی نہیں چلتا۔ معصوم روحیں تو بس بھنے ہوئے کباب ہو کر رہ گئیں، ہونٹوں کی لالی خون ہو کر بہی جا رہی ہے۔ اور محبت ہاتھ کی صفائی بن گئی صاحبان کیسے کیسے رنگ برنگے مناظر، اور جب نگاہ پلٹی تو پچھتاوے کے علاوہ کچھ بھی نہ تھا۔

اس کا شام کا کیا ہوا۔ میک اپ اب آنسوؤں سے دھل رہا تھا۔ بھری رات میں سنسان گلیاں دیکھو تو دن کی چہل پہل یاد آنے لگتی ہے۔ وہ سسک سسک کر رو رہی تھی۔ اور پرانی باتیں یاد کرتی جا رہی تھی۔

ان دنوں جب اس کا شوہر محبوب تھا۔ اس کی دنیا بڑی ہی حسین تھی۔ اماں ہر وقت روٹی بوٹی کا حساب لگایا کرتیں، بہت سے بھوتوں کے کھانے کا غم انہیں کھایا کرتا۔ اور وہ کڑھتی کہ آخر اماں اتنی بہت سی فضول باتوں میں کیوں پڑی رہتی ہیں۔ اگر گھر میں چراغ نہیں جلا تو نہ سہی، وہ سوچتی کہ آخر چاند کی ٹھنڈی روشنی کا تصور کیوں نہیں کیا جاتا۔ آسمان پر جلتے ہوئے روپہلے دیئے آخر کس کام کے ہوتے ہیں۔ اور اماں کسی ایسی چیز کا خیال کرکے کیوں نہیں خوش رہتیں۔ جو انہیں فکروں سے آزاد کر دے۔ وہ تو ہر وقت اپنے محبوب کے خیال میں گم رہتی ہے۔ اس کا خیال تھا کہ محبوب شداد تو شداد اللہ میاں کی جنت سے بھی کہیں زیادہ خوبصورت حقیقت ہے۔ راتوں کو جب ہر طرف سناٹا پھنکارنے لگتا تو وہ اٹھ کر اپنے محبوب سے جا ملتی، وہ بڑی بے چینی سے اس کا منتظر رہتا۔ اسے پاکر وہ بچوں کی طرح خوش ہونے لگتا۔ اس سے بے شمار محبت کی باتیں کرتا۔ اسے اپنے کالج کے زمانے کے قصے سناتا کہ جب وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ چاندنی راتوں میں بیٹھ کر محبوباؤں کی باتیں سنتا تو مارے دکھ کے کچھ بھی نہ بول پاتا۔ سب لڑکوں کی کوئی نہ کوئی محبوبہ تھی۔ وہ سب ان کی یاد میں آہیں بھرتے تھے۔ ایک لڑکے نے تو ناکامی کے باعث خودکشی کرلی تھی۔ ان لڑکوں کے بیچ میں وہ خود کو بڑا بدنصیب خیال کرتا تھا۔ کیونکہ اس وقت اس کی کوئی محبوبہ نہ تھی۔ ایسے قصے سناکر وہ اسے دیکھتا تو مارے فخر کے وہ پھولے نہ سماتی۔

ان دنوں اس کے محبوب کی عجیب حالت تھی۔ اسے نہ اس بات کا خیال تھا

کہ ایک اچھی ملازمت حاصل کر کے مستقبل بنانا ہے یا دنیا کے دوسرے کام بھی ہوتے ہیں۔ بس سارا دن ایک تنگ و تاریک کمرے میں پڑا اس کا انتظار کیا کرتا رہا تھا۔ نوکری کی تلاش میں اور محبت کو سب سے بڑی دولت سمجھ کر بیٹھ رہا تھا۔ اگر وہ اسے احساس دلاتی کہ ابھی تم کو کچھ کرنا ہے تو وہ ایک دم رنجیدہ ہو جاتا وہ اس سے التجا کرنے لگتا کہ دنیا کی کوئی دوسری بات نہ کرو۔ وہ محبت پا کر سب کچھ بھلا دینا چاہتا ہے۔ اتنی زیادہ محبت کے اظہار نے اسے واقعی بہت مغرور بنا دیا تھا۔ کبھی کبھی تو وہ اس کی محبت سے فائدہ اٹھا کر اسے ایذا پہنچایا کرتی۔ اس سے ملنے میں دیر کرتی یا پھر ایک آدھ دن بالکل ہی گول ہو جاتی پھر جب اس سے ملنے جاتی تو گھنٹوں دوپٹے کی آنچل سے اس کے آنسو پونچھنا پڑتے۔ یوں چھپ چھپ کر ملنے اور ایذا پہنچانے میں اسے بڑا لطف آتا تھا۔ پھر بھی چاہتی تھی کہ کوئی بندھن نہ رہے۔ مگر مشکل یہ تھی کہ اس کا محبوب دنیا کی کوئی دوسری بات سنتا ہی نہ تھا۔ بیکاری اور دونوں کے بڑے بوڑھوں کی خاندانی دشمنی راہ میں کانٹے بچھا رہی تھی۔ دشمنی تو خیر ایک طرف رہی تھی۔ بیکاری کا خاتمہ ہوا تو اس طرح کہ وہ سخت ٹائیفائڈ میں مبتلا ہو گئی۔ گھر میں اتنا نہ تھا۔ کہ اس کا معقول علاج ہو سکتا۔ وہ موت کے کنارے لگ گئی۔ اس نے رات دن دعائیں اور تیمارداری کی۔ پھر جس دن وہ ذرا اچھی ہوئی تو اس کے محبوب نے عہد کیا کہ اب صرف اس کی خاطر ایک اچھی ملازمت حاصل کر کے رہے گا۔ ہوا بھی یہی۔ ان تھک کوششوں کے بعد اس نے خاصی ملازمت حاصل کر لی۔ اس کے بعد جس روز وہ خود کو اس کے باپ کے سامنے پیش کرنے والا

تھا تو ساری رات اختلاج میں پڑا رہا ناکامی کے خوف سے اس کا برا حال تھا۔ وہ اسے تسلّی دیتی رہی کہ کامیابی یقینی ہے۔ ابا نے وہ درخواست یوں منظور کی کہ جیسے گھر کا کوڑا صاف ہو گیا۔

پیغام منظور ہونے کے بعد وہ اس گھر سے چلا گیا۔ اور الگ مکان کرایہ پر لے کر رہنے لگا۔ دو مہینے کی تنخواہ سے گھر کو آراستہ کیا اور خود نان کباب بازار سے کھا کھا کر اپنی صحت تباہ کی۔ وہ اس کی صحت کی تباہی کی خبریں سن کر اپنے اوپر ناز کرنے لگی تھی۔ آخر یہ سب کچھ اسی کے لئے تو ہے۔ پھر اس کی شادی ہو گئی چاندنی کے سائے میں وہ رخصت ہو کر نئے گھر آ گئی، اس کے محبوب نے بڑے سلیقے سے گھر سجایا تھا۔ دونوں کمروں میں گلاب کے سرخ پھولوں کے گلدستے کھلکھلا رہے تھے۔ اس رات ان دونوں نے انہی ہنستے ہوئے پھولوں کی طرح زندگی گزارنے کا عہد کیا تھا۔

شادی کا ایک سال یوں گزر گیا جیسے وہ ہوائی جہاز پہ بیٹھ کر بس چند میل گئی ہو۔ پھر زندگی نے ایک کروٹ سے پڑے پڑے دوسری کروٹ لی۔ دوسری کروٹ بدلی تو تکان سے برا حال تھا۔ اب وہ منہ پھلائے پھرتی۔ اسے انتظار رہتا کہ کب وہ اسے منائے گا۔ اور وہ شکایتوں کے دفتر کھول دے گی۔ اسے گزری ہوئی باتیں یاد دلائے گی۔ ہوتا بھی یہی کہ وہ دوسرے تیسرے دن بڑی گرمجوشی کے ساتھ اسے منا لیتا۔ ساری شکائیتیں سنتا اور شرمندگی سے سر جھکا دیتا۔ پھر یہ دور بھی ختم ہو گیا۔ وہ اسے شکایتوں کا وقت ہی نہ دیتا۔ اس کی زندگی بے حد مصروف ہوتی جا رہی تھی۔ اب وہ تھوڑی دیر باتیں کرتا بھی تو

اپنی ذات سے متعلق' اب اس کی ترقی ہونے والی ہے۔ اب اس کا مستقبل صحیح معنوں میں سنورنے والا ہے۔ وہ یوں محنت سے کام کرتا ہے! اور یوں افسروں کو خوش رکھتا ہے۔" ——— اسے یہ باتیں ذرا بھی اچھی نہ لگتیں اسے تو اپنا مستقبل تاریک ہوتا نظر آنے لگتا۔ وہ ملی ہوئی دولت کو چھنتے نہ دیکھ سکتی تھی۔ وہ تنہا گھر میں پڑے پڑے سارا دن انہیں خیالات میں الجھی رہتی کہ پہلے وہ ایسا تھا۔ اور اب ویسا ہو گیا ہے۔ پہلے یوں تھا۔ اور اب نہیں ہے اس "ہے" اور "نہیں ہے" نے اسے بڑا رنجیدہ اور تلخ بنا دیا تھا۔

ایک دن اس نے محسوس کیا کہ وہ ماں بننے والی ہے۔ اس دن اس نے بڑی عجیب سی مسرت محسوس کی۔ اس کے پاؤں جیسے زمین کے اوپر ہی پڑ رہے تھے۔ ایک پیارا سا بچہ اس کے سامنے پڑا پاؤں ہلا رہا تھا۔ سارا دن اس نے بڑی بے تابی سے شوہر کے آنے کا انتظار کیا۔ وہ بار بار یہی سوچ رہی تھی۔ کہ اس کا شوہر جب بچے کے لیے معلوم کرے گا۔ تو خوشی سے چیخ پڑے گا۔ بڑی محبت سے بچے کی پرورش کے پروگرام بنائے گا۔ اسے یاد تھا کہ جب اس کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ جب بھی اس کے شوہر نے دو تین بار کہا تھا کہ بچہ زندگی کی بہت بڑی مسرت ہوتا ہے۔ اور وہ جھینپ کر رہ گئی تھی۔ مارے شرم کے وہ ایک دن تک اس سے نہ ملی تھی۔ شام کو جب وہ دفتر سے آیا تو وہ مارے خوشی کے اس کے سینے سے لگ گئی۔ اسے یہ بہت بڑی خوشخبری پھولی ہوئی سانسوں کے درمیان سنا ڈالی۔ "مبارک ہو۔ تم تو اب ماں بن جاؤ گی" وہ شرارت سے مسکرایا اور پھر فوراً ہی کوٹ اتار کر تھکا تھکا سا کرسی پر لیٹ گیا۔

وہ اس انتظار میں پاس بیٹھ گئی کہ اب شاید بچے کے متعلق باتیں کرے گا مگر وہ اِدھر اُدھر کی باتیں بنانے لگا۔ وہ مارے مایوسی کے کچھ کہے بغیر اس کے پاس سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

اب وہ سارا دن تنہا پڑی سوتے کیا کرتی، اسے ان دنوں ہمدردی اور محبت کی شدت سے ضرورت محسوس ہوتی۔ مگر تنہا گھر میں ہمدردی کرنے والا کون تھا۔ اس کی کتنی ہی طبیعت خراب ہوتی۔ لیکن اس کا شوہر دفتر سے چھٹی لینے کا ذکر تک نہ کرتا۔ وہ صرف دوائیں لے کر دے جاتا۔ جنہیں وہ پینے کی بجائے پھینک دیا کرتی۔ شام کو جب وہ دفتر سے واپس آتا تو اسے یوں پوچھتا جیسے کوئی خاص بات نہیں۔ ساری دنیا کی عورتوں کو ایسی تکلیف ہو جایا کرتی ہے۔ ادھر اس کی یہ حالت ہو رہی تھی کہ جب طبیعت زیادہ خراب ہوتی تو اسے اس خیال سے نفرت ہونے لگتی۔ کہ ایک نئی زندگی اس کے جسم میں پرورش پا رہی ہے۔

بچی پیدا ہوئی تو اس کے شوہر نے اسے بڑی حیرت سے دیکھا۔ خوبصورت ماں باپ کی بڑی بدصورت اولاد تھی۔ خود اسے بھی وہ جان ذرا اچھی نہ لگی پھر بھی اس کی مامتا بھڑک اٹھی اور اس نے کئی بار اسے سینے سے لگا کر چوما بھی، پلنے کا بار بھی اسے تنہا اٹھانا پڑا۔ بدصورت اور خراب صحت والی بچی دن رات رویا کرتی۔ رات کو جب بچی روتی تو وہ دیر تک اسے چُپ نہ کراتی صرف اس لئے کہ شاید اس کا شوہر جاگ کر بچی کو چُپ کرانے میں اس کی مدد کرے اور پھر وہ دونوں دیر تک باتیں کریں، اس طرح راتوں کو جاگنے کی

کی ساری کوفت ختم ہو جائے۔ بے خوابی پھر پہلے کی طرح حسین بن جائے۔ مگر شوہر اسی طرح سویا رہتا، ننھی سی "ریں ریں" اس کی نیند میں خلل نہ ڈال پاتی۔ اس وقت بچی اسے بہت بُری لگتی۔ ممتا کی بجائے اس کے دل میں دبی دبی نفرت جاگنے لگتی۔ اس میں خودداری اور پہلی محبت کا غرور اتنا تھا کہ وہ اُسے خود نہ جگاتی ۔۔ کیونکہ اس کے نہ اٹھنے سے جو ٹھیس لگتی اس کی برداشت سے باہر تھی۔

آج رات اتنی پیاری تھی کہ اسے جگانے پر مجبور ہو گئی تھی۔ دیر تک رونے کے بعد جب اس نے جلتی ہوئی آنکھیں کھولیں تو رات کا سارا حُسن جیسے آندھیوں کے غبار میں فنا ہو گیا تھا۔

صبح جب وہ سو کر اُٹھی تو رونے کی وجہ سے آنکھیں پھول کر کُپا ہو رہی تھیں۔ بچی کو پالنے میں ڈال کر وہ ناشتے کی تیاری میں لگ گئی۔ آج بھی اس کا شوہر ہمیشہ کی طرح دیر سے سو کر اُٹھا تھا اور اب دفتر جاتے کی ایسے ہی تماشا تیاری کر رہا تھا۔ جیسے ایک ایک منٹ کی دیر سے اسے سولی پر چڑھا دے گی۔ اس نے بڑی پھرتی سے چائے بنا کر دو پراٹھے الٹ لئے اور جب اس کے سامنے لے کر آئی تو اس طرح سامنے بیٹھی کہ شوہر اس کی سوجی ہوئی آنکھوں کو اچھی طرح دیکھ سکے۔ لیکن وہ کتنی بار اسے دیکھنے کے بعد بھی ان آنکھوں کو پہچان نہ سکا۔ جو اس کی خاطر رات بھر روتی رہی تھیں۔ پھر بھی انتظار کر رہی تھی کہ اب آنکھیں پھولنے کی وجہ پوچھے گا اور جب " آج پراٹھے بہت اچھے پکائے ہیں "۔

ہوں"۔ اس نے اپنی پھولی ہوئی آنکھیں اس کی آنکھوں میں گڑو دینے کی کوشش کی۔

"بعض دن تو ایسا بدمزہ ناشتہ ہوتا ہے کہ کھانے کو جی نہیں چاہتا"

"ہوں"! اس نے مایوسی سے نظریں جھکالیں، وہ روز کی طرح آج بھی چھوٹے چھوٹے جواب دے کر اپنی ناراضگی کا اظہار کر رہی تھی۔

"بھئی اب تو چلئے، بہت دیر ہوگئی۔ صبح آنکھ ہی نہیں کھلتی" وہ کا آخری گھونٹ پی کر اٹھ کھڑا ہوا۔

اس کا انتظار دم توڑ کر رہ گیا۔ جی چاہا کر خوب سسک سسک کر روئے۔

"جلدی آجانا، سارا دن جی گھبراتا ہے"۔ وہ نہ بولنا چاہتی تھی۔ پھر بھی عادت سے مجبور ہو کر بول پڑی۔ اس کی عادت تھی کہ جب وہ دفتر جانے لگتا تو جلد واپس آنے کو کہتی۔ اور وہ اچھا کہہ کر چلا جاتا۔

"جلدی واپس آجانا چہ خوش ——— وہ ایک دم جھلا اٹھا ——— پتہ نہیں تم کس دنیا میں رہتی ہو، میں سارا دن گھر میں بیٹھ کر صرف معاشقہ تو نہیں کر سکتا۔ زندگی کے دوسرے کام بھی ہیں۔ جی گھبراتا ہے۔ تو اسے بہلا لینا، دنیا کی عورتیں گھروں میں رہتی ہیں۔ کوئی شوہر پہلو سے لگا بیٹھا رہتا ہے۔

ارے! ——— اس نے حیران نظروں سے شوہر کو دیکھا ——— تم اس بری طرح بول سکتے ہو؟" وہ اتنے عرصہ میں آج پہلی مرتبہ اتنی سختی سے بولا تھا۔ ورنہ کچھ بھی ہو۔ اس کا لہجہ ہمیشہ نرم رہتا۔ لہجے کی نرمی ہی تو اس

کی شخصیت کی نمایاں چیز تھی ۔

"معاف کرنا بھئی" وہ کچھ شرمندہ سا ہو کر ہنسا ـــــــ مگر تمہیں بھی تو سوچنا چاہیے ۔ زندگی یوں نہیں گزرا کرتی" وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر سہلاتے لگا۔ ـــــــ ہنسی خوشی رہا کرو، مجھے رنج ہوتا ہے تمہیں رنجیدہ دیکھ کر"

وہ آستین سرکا کر گھڑی دیکھنے لگا اور پھر اس کے سر پر ہاتھ پھیرتا ہوا تیزی سے باہر چلا گیا۔

شوہر کے جاتے کے بعد وہ چند منٹ تک سکتے کے عالم میں کھڑی رہی اور پھر الٹے پلٹے بستر پر جیسے گر سی پڑی ۔ آج کی کھری کھری باتوں نے اس کا ذہن بالکل صاف کر دیا تھا ۔ محبت اس کے سامنے بال بکھرائے کھڑی سر پیٹ رہی تھی ۔ وہ خود بھی اس ماتم میں شریک ہو گئی اور جب ذرا دل کی بھڑاس نکلی تو اس نے جلتی ہوئی آنکھیں بند کر کے سوچنا شروع کر دیا ۔ کیسا اچھا ہوتا جو وہ بھی کہیں کام کرنے چلی جایا کرتی ۔ پھر اس ویرانی اور تنہائی کا سامنا نہ ہوتا ۔ پھر وہ صرف اس بیدرد انسان کے لئے ہی نہ سوچتی رہتی جو اس کے جذبات پہچاننے سے بھی انکار کر رہا ہے ۔ اس سے کہتا ہے کہ تم بھی سب عورتوں کی طرح گھر میں رہ کر جی بہلاؤ ۔ شوہر سے کچھ نہ چاہو، کھاؤ، پیو اور موج اڑاؤ ۔ ہی ـــــــ اسے تو اس زندگی کے تصور سے بھی گھن آنے لگتی ۔ مگر زندگی کیسے گزرے ۔ آخر کس طرح گزرے، وہ کیا کرے ۔ اتنا بھی تو نہیں کہ کہیں ادھر ادھر جا کر بیٹھ رہے، دو گھڑی جی بہلائے ۔ بچی ایک لمحے کی فرصت نہیں لینے دیتی ـــــــ اب اسے بچی پر غصہ آنے لگا جیسے وہ صرف اسی کے گناہوں

کا نتیجہ ہے۔ جیتے جی کو اٹھا کر پھینکا بھی تو نہیں جاتا جو نجات مل جائے۔
——— اس نے بڑی نفرت سے بچی کو دیکھا۔ جو پالنے میں پڑی ہاتھ پاؤں مار مار کر اب رونے کے قریب ہو رہی تھی ——— مارے غصے کے اس کا جی چاہ رہا تھا کہ اپنے آپ کو پھاڑ کر پھینک دے ——— وہ ایسی زندگی نہیں گزار سکتی۔ بالکل نہیں ——— اس نے بچی کی طرف سے منہ پھیر کر آنکھیں بند کر لیں۔ اس کا دماغ پکے پھوڑے کی طرح تپک رہا تھا۔

بچی نے رونے کا سلسلہ شروع کیا تو بس ہی نہ کر رہی تھی اور وہ تھی کہ اسے اٹھا کر دودھ پلانے کا نام نہ لے رہی تھی یہاں تک کہ بچی روتے روتے بے سدھ ہو گئی تھی، اب اس کی آواز بھی مشکل سے نکل رہی تھی۔ وہ دور لیٹی پڑی بے دردی سے اس کے رونے کی آواز سنتی رہی مگر جب دیکھا کہ بچی آنکھیں بھی نہیں کھول سکتی تو اس کی مامتا بھڑک اٹھی۔ اس نے اسے اٹھا کر سینے سے لگا لیا اور دودھ پلانے لگی ———. اس نے غور سے بچی کو دیکھا، جو دودھ پیتے ہوئے ننھی ننھی سسکیاں بھر رہی تھی۔

بچی کو پالنے میں لٹا کر وہ یوں ہی کمروں اور صحن کے چکر کاٹنے لگی، آج بھی وقت اپاہجوں کی طرح گھسٹ رہا تھا۔ لیکن اسے اپنے شوہر کا انتظار نہ تھا۔ نہ وہ اس سے خیال ہی خیال میں شکایتیں کر رہی تھی، نہ اس کی پچھلی محبت سے منہ میٹھا کر رہی تھی اور نہ پھر سے محبت اور توجہ ——— حاصل کرنے کے گر سوچ رہی تھی ——— آج تو بس اسے لفظ محبت سے کراہت محسوس ہو رہی تھی۔ آج اس کا یہ خیال بالکل صحیح ہو گیا کہ محبت نام کی دنیا میں کوئی چیز نہیں۔

جب اس کے شوہر کے آنے کا وقت قریب آیا تو وہ کمرے میں جاکر آرام کرسی پر بڑے اطمینان سے لیٹ گئی۔ اس نے نہ تو ہونٹوں پر سرخی لگائی اور نہ بالوں کو درست کیا۔ بس یوں ہی چھت کی کڑیوں کو تکتی رہی۔ کسی کسی وقت عادت کے مطابق اس کی نظریں دروازے کی طرف اٹھ جاتیں اور سامنے لگے ہوئے آئینے کو دیکھ کر پھر چھت تکنے لگتیں۔

وہ آیا تو اس کے ساتھ رفیق بھی تھا۔ رفیق کو دیکھتے ہی وہ سمٹ چرط گئی۔ اس کے دماغ کے نہ جانے کس گوشے سے یہ خیال چونکا کہ اگر رفیق نہ ہوتا تو شاید وہ اس سے یوں اجاڑ پڑے ہونے کی وجہ پوچھتا۔ مگر اب تو یہ سہارا بھی ہاتھ سے گیا۔ رفیق سے وہ ویسے بھی کیا کم نفرت کرتی تھی۔ نفرت کا یہ سلسلہ اس وقت سے شروع ہوا تھا جب نئی نئی شادی کے زمانے میں وہ آکر پہروں بیٹھا فضول فضول سے مذاق کرتا رہتا اور ذرا بھی نہ سوچتا کہ کتنے قیمتی لمحات چرا رہا ہے۔

"بھئی رفیق کو چائے تو پلا ڈالو، دیکھو نا بے چارہ تین چار دن بعد آیا ہے، کچھ بیمار تھا۔" دفتر سے آکر آج اس کے شوہر کا موڈ بڑا اچھا ہو رہا تھا۔

"مگر جناب کیوں یتیم بنی بیٹھی ہیں؟" رفیق بڑے بیے ڈھنگے پن سے ہنسا۔

"کچھ بھی تو نہیں!" وہ زبردستی ہنستی ہوئی اٹھی اور اتنی تیزی میں کمرے سے باہر نکلی۔ جیسے اسے کوئی پکڑنے آرہا ہو۔

جب وہ چائے تیار کر رہی تھی تو بچی کے رونے کی آوازیں آنے لگیں۔ ساتھ ہی رفیق کی بھونڈی آواز بھی شامل تھی۔ وہ عجیب عجیب سی آوازیں نکال

دو غا۔ ہو ہو ——— ہاہا، میری بچی، میری منّی پنّی ٹنّی۔ ایک لمحے کو اسے یہ بول بڑے پیارے لگے، اس کا تو تصوّر بھی یہی تھا کہ وہ کام کر رہی ہے اور بچی کو اس کا شوہر کھلا رہا ہے، میری منّی، میری بچی۔ مگر یہ تو رفیق تھا۔ جیسے یہ سب کچھ کہنا چاہیے تھا۔ اس کی آواز تو کہیں دور دور نہ سنائی دے رہی تھی۔ "کم بخت خواہ مخواہ اترا رہا ہے۔" وہ زیرِ لب بڑبڑائی۔ اگر اس کی یہ اپنی بچی ہوتی تو یقیناً پاسنے میں بڑی پاتس بن رہی ہوتی۔ سب جھوٹے مکار ہوتے ہیں ———

اس نے جھلا کر کیتلی میں کھولتا ہوا پانی ڈالا جو چھلک کر پاؤں جھلسا گیا۔ وہ اور بھی جل گئی۔

چائے کی کشتی لئے جب وہ اندر گئی تو رفیق بچی کو سینے سے لگائے چوم رہا تھا۔ اسے تھپک رہا تھا اور اونٹوں کی طرح کھڑا جھوم رہا تھا۔ اس کا شوہر آرام کرسی پر لیٹا کوٹ کی آستینوں سے گرد جھاڑ رہا تھا۔ بچی کو چپ چاپ سینے سے لگے دیکھ کر اسے رفیق سے اور بھی نفرت ہو گئی۔

"ادھر لاؤ بچی کو تم چائے پیو۔" اس کے لہجے میں سختی تھی۔

"نہیں دیتا ——— وہ اٹھلایا ——— ہوں ——— ہوں، میرے پاس رہے گی یا اماں پاس جائے گی؟" وہ بچی کے گال نوچنے لگا۔

"مجھے دو ورنہ چائے ٹھنڈی ہو جائے گی۔" وہ تلخی پر قابو پاتے ہوئے آہستہ سے بولی اور آگے بڑھ کر بچی کو گود میں لے لیا۔

رفیق اور اس کا شوہر دیر تک بیٹھے ادھر ادھر کی گپیں ہانکتے رہے۔ اس

کا جی چاہ رہا تھا کہ کان پکڑ کر اس رفیق کے بچے کو باہر کر دے مگر چپ چاپ بیٹھی زانو پر لیٹی ہوئی بچی کو آہستہ آہستہ ہلاتی رہی۔ جب وہ جانے کے لئے کھڑا ہوا تو اس نے اطمینان کی لمبی سانس لی۔

آج تم بہت بور تھیں بھابی۔" رفیق خواہ مخواہ زور سے ہنسا اور ساتھ ہی اس کا شوہر بھی ہنسنے لگا۔

"یہ کبھی کبھی یوں ہی سنجیدہ ہو جاتا کرتی ہے۔"

"کل آؤ گے؟ اس نے اخلاقاً پوچھا۔

"اب کون آتا ہے تم تو منہ پھلا کر بیٹھتی ہو۔" وہ بے تحاشا ہنستا ہوا سلام کر کے چلا گیا۔

"آج تم کچھ چپ چپ ہو۔" رفیق کے جانے کے بعد اس کا شوہر پاس آکر بیٹھ گیا۔

"قطعی نہیں،" اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اس وقت پھر بے ساختہ اس کا جی چاہا کہ جی بھر کر اس سے باتیں کرے اور سارے شکوے شکایتیں ختم کر ڈالے۔

"اچھا تو پھر جلدی سے کھانا کھلا دو، بڑی رات ہو رہی ہے۔ کم بخت رفیق تو آج حجم کر رہ گیا۔"

"اچھا!" دھڑکتا ہوا دل عذاب سے ڈوب گیا۔ اسے امید تھی کہ وہ خاموشی کی وجہ معلوم کر کے رہے گا۔ مگر اسے تو پیٹ کی فکر پڑ گئی۔ کھانے کے بعد دونوں اپنے بستروں پر چلے گئے۔

"میرے پاس بھاگ آؤ ننو" اس کے شوہر نے کروٹ لے کر بڑے پیار سے بلایا۔

"نہیں" وہ بڑی بے دردی سے تقریباً چیخ پڑی ——— میں سارا دن کی تھکی ہوں، نیند آرہی ہے" وہ اس طرح پیار سے بلانے کا مطلب خوب سمجھتی تھی۔

"اچھا" اس کے شوہر کی آواز میں بھرپور جاڑا لہریں لے رہا تھا۔

صبح اس کے شوہر کا منہ پھولا ہوا تھا۔ وہ اپنی ناراضگی کا اسی طرح اظہار کیا کرتا۔ اس نے دیکھا لیکن ذرا بھی پروا نہ کی۔ ناشتہ بڑی خاموشی سے کیا گیا۔ جب وہ دفتر چلا گیا تو اس کے دل میں پھر وہی خواہش جاگنے لگی۔ کاش وہ بھی کہیں جاتی، کوئی کام کرتی اور رات کو تھکی جان آرام سے سو رہتی۔ اتنا بڑا لو دھوپ کا دن اسے دھمکیاں دے رہا تھا۔ ذرا دیر تک وہ اپنی بے بسی پر روتی رہی اور پھر آپ ہی چپ ہو بیٹھی۔ پھر دن یوں ہی گزرا کہ نئی اور پرانی باتوں کے ملبے تلے پڑی کراہتی رہی۔

شام کو زور کی آندھی چلی اور پھر بادل چھا گئے۔ شام کو بادل چھا جائیں تو کیسی عجیب سی اداسی چھا جاتی ہے۔ وہ کمرے میں منہ چھپائے پڑی تھی۔ اس کا شوہر آج اب تک نہ آیا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ کہیں یار دوستوں میں بیٹھ کر موج کر رہا ہوگا۔

رات کے گیارہ بجے اس کا شوہر آیا تو اس کے چہرے پر دہشت برس رہی تھی۔ اس نے بتایا کہ اس کا ایک دوست کار کے حادثے سے مر

گیا۔ وہ ابھی اسے دفنا کر آ رہا ہے۔ وہ اسی طرح چپ چاپ بیٹھی رہی۔ اظہارِ افسوس بھی نہ کیا۔ شوہر کو رنجیدہ اور پریشان دیکھ کر اسے کچھ اطمینان سا ہوا کہ چلو یار دوستوں میں گپ تو نہ مار رہا تھا۔ اپنے دوست کو یاد کر رہا تھا اور پریشان تھا ——————— کھانا کھائے بغیر وہ اپنے بستر پر چلا گیا۔

بہت سے دن، بہت سی راتیں یوں ہی گزرتی چلی جا رہی تھیں۔ اس کی زندگی کا وہی ڈھرا تھا۔ لو دھوپ کا طویل موسم گزر چکا تھا اور اب آسمان پر گہرے سیاہ بادل منڈلا رہے تھے۔ وہ پہروں سر جھکائے چپ چاپ بیٹھی ایک ہی جیسے خیالات میں الجھی رہتی۔ سرد سرد ہوائیں اسے چھو کر نکل جاتیں پچھی ردر دکر گلا سکھایا کرتی مگر وہ اس طرح بیٹھی رہتی۔ جیسے کوئی سکتے کا پلہ رو رہا ہو۔ شام کو جب شوہر گھر آتا تو ادھر ادھر کی باتیں چھیڑ دیتا۔ وہ ان باتوں کو بڑے صبر کے ساتھ سنتی اور معمولی معمولی جواب دیتی رہتی۔ ویسے وہ کوشش کرتی کہ اس کے آنے پر کسی نہ کسی کام میں الجھ جائے۔

آج صبح سے وہ سخت بیزار ہو رہی تھی۔ بادلوں سے لدا پھندا دن اسے کاٹنے کو دوڑ رہا تھا۔ وہ کیا کرے، کہاں جائے۔ زندگی اس طرح کیسے گزرے، اتنا بھی تو نہ تھا کہ وہ کہیں جا کر دل بہلائے۔ مرجھلی بیمار پچی ایک جان، ریں ریں کرتی رہتی۔ آج اسے پچھلی برسات کے دن بھی یاد آ رہے تھے۔ جب اس کا شوہر بادل دیکھ کر اس کی ذرا سی خواہش پر چھٹی کی درخواست لکھ بھیجتا تھا۔ اُس برسات میں اور اِس برسات میں کتنا بڑا فرق تھا۔ اس کا دل رو رہا تھا اور ادھر بچی ایک لمحہ ضائع کئے بغیر جانے کیوں روئے جا رہی تھی۔

اس کی وحشت اس قدر تھی کہ اس نے روتی ہوئی بچی کو پالنے میں ڈال کر کمرے کا دروازہ باہر سے بند کر دیا اور پھر پڑوس میں جا کر بیٹھ گئی۔ کئی گھنٹے اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد جب وہ واپس آئی تو بچی روتے روتے بے سدھ ہو چکی تھی، اس کے ہونٹ نیلے پڑ گئے تھے، ناخنوں سے خون کا آخری قطرہ تک غائب ہو گیا تھا اور ہاتھ پاؤں برف ہو رہے تھے۔ اس نے بے تابی سے بچی کو ہلایا، بچی کی سانس بھی نہ محسوس ہو رہی تھی، وہ اسے سینے سے لگا کر زور سے رو پڑی۔ اس کے دل میں عجیب سا درد ہونے لگا۔ لیکن بچی نے تھوڑی دیر بعد ماں کی گرم آغوش میں آنکھیں کھول دیں تو وہ حیرت سے اسے دیکھنے لگی۔ اس کے آنسو ایک دم رک گئے۔ بچی کو بڑی اغنائی سے دودھ پلا کر پالنے میں ڈال دیا اور پالنے کی طرف سے منہ پھیر کر وہ دیر تک اداس رہی۔

رات بارش خاصی تیز ہونے لگی۔ کمرے کے آگے پڑا ہوا ٹین کا سائبان سخت شور مچا رہا تھا۔ اس کا شوہر سو رہا تھا اور وہ آنکھیں بند کئے جاگ رہی تھی۔ اسے اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ اسے کیا معلوم تھا کہ برسات کی گزری ہوئی راتیں اب اس سے انتقام لیں گی۔ وہ کبھی کسی وقت آنکھیں کھول کر سوتے ہوئے شوہر کو دیکھتی اور بڑبڑا اٹھتی "کم بخت موت کی نیند سو رہا ہے"، جانے کیوں اس کا جی چاہا کہ وہ اس کو بھی نہ سونے دے، ساری رات جگائے، اس کی طبیعت خراب کر دے۔ دفتر جانے میں دیر کرا دے، اسے افسر کی جھڑکیاں سننا پڑیں اور وہ وہاں کوئی کام نہ کرے، بس اونگھتا رہے، کرسی سے سر ٹکراتا رہے۔ اس نے سوتی ہوئی بچی کو زبردستی جگا دیا۔ بچی نے جاگ کر اپنا منہ اس

کے بازوؤں میں چھپانا شروع کیا تو اس نے بے دردی سے اس کو گھسیٹ کر الگ کر دیا۔ دودھ نہ ملنے کی وجہ سے بچی بے تحاشا رونے لگی اور اس بُری طرح سے روئی کہ واقعی اس کے شوہر کا سونا دوبھر ہو گیا۔

" یہ کیوں رو رہی ہے ؟ کروٹ لے کر اس نے بڑی نرمی سے پوچھا۔

" مجھے کیا معلوم ؟" اس نے لاپرواہی سے جواب دیا۔

" دودھ پلا دو " اس کی آواز میں التجا تھی۔

پی چکی ہے، اب ہڈیاں تو چبلتے سے رہی " وہ صاف جھوٹ بول گئی۔

" پھر اسے اٹھا کر پٹخ دو ——— وہ ایک دم چیخ پڑا ——— سارا دن تھک مر کر آؤ تب بھی چین کی نیند نہ سو سکو ——— اس نے جھلا کر کروٹ بدلی اور بازوؤں میں منہ چھپا کر پاؤں ہلانے لگا۔

اٹھا کر پٹخنے والی بات جیسے اس کے کلیجے میں گڑ کر رہ گئی جواب دینے کی بجائے اس نے ہونٹ بھینچ لئے ——— وہ اپنی بچی سے بھی نفرت کرتا ہے۔ وہ سونے کی خاطر اسے پھینک سکتا ہے وہ اپنے عیش میں کسی قسم کی کمی نہیں دیکھ سکتا۔ بچی پیدا ہو گئی ہے تو خدا کی مرضی، وہ صرف پرورش کے لئے روپے دے دیتا ہے۔ اسے رتی برابر بھی تو محبت نہیں ——— کتنی فضول سی زندگی ہے کم بخت کی۔ کتنی حقیر ہے، مگر پھر بھی جئے جا رہی ہے ——— بچی کے لئے اس کے دل میں بیک وقت نفرت اور رحم کے جذبات جاگنے لگے۔ اس نے روتی ہوئی جان کو قریب کر کے سینے سے لگا لیا۔ جب بچی چپ ہو گئی تو وہ خود سسک سسک کر روتی رہی اور پھر اسی عالم میں سو گئی۔

سوتے کو تو وہ سو رہی تھی۔ لیکن ایسی بے چین نیند تھی کہ "پٹخ دو" اس کے دماغ میں گونج رہا تھا۔ اس کا دل بچی کی نفرت سے بھرا جا رہا تھا۔ اور اب وہ سوتے میں اپنے شوہر سے پھر بھر کر لڑ رہی تھی۔ اس کے ہونٹ بار بار لرز رہے تھے ـــــــ وہ تنہا اسے پالنے پر مجبور نہیں کی جا سکتی، وہ صرف اس کے گناہوں کا خمیازہ نہیں، وہ واقعی اسے اٹھا کر پٹخ سکتی ہے ـــــــ اس کے ہاتھ بار بار اوپر اٹھ رہے تھے اور پھر ایک بار اس کے ہاتھوں نے بچی کو مضبوطی سے تھام لیا۔

ایک باریک چیخ بلند ہوئی اور پھر سناٹا چھا گیا۔ وہ بوکھلا کر جاگ اٹھی۔ اس کا شوہر ایک ہی جست میں بستر سے پھاند پڑا تھا۔ بچی پلنگ سے کچھ دور پکی اینٹوں کے فرش پر پڑی تھی۔ اس کے سر سے خون کی پتلی سی دھار فوارے کی طرح چھوٹ رہی تھی۔ وہ خوف و رنج سے بے تحاشا چیخ پڑی۔ اس کے شوہر نے پاگلوں کی طرح جھپٹ کر بچی کو اٹھا لیا۔ اس کے سینے پر ہاتھ رکھ کر سانس دیکھی اور پھر سینے سے لگا کر بے تحاشا باہر بھاگ گیا۔ وہ پاگلوں کی طرح فرش پر گرے ہوئے خون کو کھڑی دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں اور دل جیسے ساکت ہوا جا رہا تھا ـــــــ ابھی وہ اسی حالت میں کھڑی تھی کہ اس کا شوہر واپس آ گیا۔ اس کے قدم تھکے تھکے سے پڑ رہے تھے اور بچی اسی طرح سینے سے لگی ہوئی تھی۔ اس نے بچی کو آہستہ سے پلنگ پر لٹا دیا اور چادر سے پورا جسم چھپا دیا۔

تمہیں اتنا دکھ نہ کرنا چاہئے، میری ممو" وہ آگے بڑھ کر اس کا سر سینے

سے لگانے لگا۔ اس کی آواز بھرا رہی تھی۔

تم نے میری بچی کو مار ڈالا" وہ زور سے چیخ پڑی۔ اس کی آنکھوں میں ایک بھی آنسو نہ تھا۔

میری نمو، اچھی نمو، پاگل نہ بنو، ہوش میں آؤ، یہ تو خدا کی مرضی تھی جو وہ گر پڑی۔ وہ سر پر ہاتھ پھیرنے لگا۔

میرے پاس سے بھاگ جاؤ۔ وہ منہ چھپا کر دوسرے کمرے میں بھاگ گئی اور پھر اوندھے منہ فرش پر لیٹ کر سسکیاں بھرنے لگی۔ اس کا دل عجیب سے درد سے پھٹا جا رہا تھا۔ اس کا شوہر اس کے قریب آکر بیٹھ گیا۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا اور خاموشی سے آہیں بھر رہا تھا۔ پھر جب صبح ہونے لگی تو وہ اٹھ کر باہر چلا گیا۔ جاتے ہوئے ایک لفظ بھی نہ کہا جیسے وہ بولنے کی طاقت کھو چکا تھا۔

جب وہ بچی کو دفنا کر گھر واپس آیا تو اس وقت بھی وہ فرش پر اوندھے منہ پڑی سسک رہی تھی۔

"نمو" ——— وہ اس کے قریب بیٹھ کر بکھرے ہوئے بال درست کرنے لگا ——— اتنا دکھ تو نہ کرو، خدا کی یہی مرضی تھی"۔ اس کی آواز آنسوؤں میں ڈوبی ہوئی تھی اور نظریں ادھر ادھر کچھ تلاش کر رہی تھیں۔

وہ اٹھ کر بیٹھ گئی اور چند منٹ تک شوہر کی آنکھوں میں چمکتے ہوئے آنسو دیکھتی رہی۔

"تمہیں اس کے مرنے کا بہت افسوس ہے؟" اس نے آہستہ سے سوال کیا۔

"ہاں! مگر اتنا نہیں کہ تمہاری طرح خود کو تباہ کرنے لگوں، تم بھی اپنے کو سنبھالو،، وہ اس کا ہاتھ سہلانے لگا۔ لیکن وہ اسے بڑی کڑوی کڑوی نظروں سے دیکھنے لگی۔

اچھا ہوا جو مر گئی" وہ چیخ کر رو پڑی۔ اس کا شوہر ایک لفظ بھی نہ بول سکا وہ بڑی بے چارگی سے سر جھکا کر اس طرح بیٹھ گیا۔ جیسے اب تسلی دے کر دکھوں کو کریدنا نہ چاہتا ہو۔ روتے روتے وہ آپ ہی تھک کر چپ ہو رہی اور پھر نیم بے ہوشی کے عالم میں اسے نیند آ گئی۔

بچی کو مرے ہوئے پندرہ بیس دن ہو گئے تھے۔ جب اس کا انتقال ہوا تھا تو اس کے شوہر نے دو دن کی چھٹی لے لی تھی۔ اب وہ پھر پہلے کی طرح دفتر جا رہا تھا۔ زندگی اسی ڈھرے پر چل رہی تھی، ذرا بھی فرق نہ تھا۔ گھر اب اور بھی ویران ہو گیا تھا۔ وہ کونوں میں منہ چھپا کر پہر دن رویا کرتی۔ بچی کی یاد اس کے دل میں کانٹے کی طرح چبھا کرتی جس وقت اسے یہ احساس ہوتا کہ اس نے اپنے ہاتھوں سے اٹھا کر پٹخا تھا تو دھیرے دھیرے چلنے سے انگلیاں مروڑتے لگتی۔ اسے اپنے شوہر سے اتنی سخت نفرت ہو چکی تھی کہ وہ اس کے خیال سے بھی کانپ اٹھتی۔ اب وہ ہر لمحے یہ سوچتی رہتی کہ اس طرح زندگی کیسے گزارے۔ اس نے ایک عرصہ بیتی ہوئی محبت کو واپس بلانے اور کڑھنے میں گزار دیا؛ مگر اب یہ نفرت کی دوزخ اسے کس طرح جینے دے گی۔ اب وہ اپنی نفرت پر قابو نہ پا سکتی تھی۔

شام کو جب اس کا شوہر آتا تو اسے آزار پہنچانے کے لئے وہ بچی کا ذکر لے کر بیٹھتی اور جب وہ ٹالنے کی کوشش کرتا تو اس کا جی چاہتا کہ بھٹیارنوں کی طرح

بڑے ۔ اسے گالیاں دے اور اپنے ناخنوں سے اس کا منہ نوچ ڈالے۔ آزاد
پہنچانے کے لئے اس نے اور بھی طریقے استعمال کرنے شروع کر دئے تھے ۔
———— وہ اس سے ہمیشہ سختی سے بات کرتی ۔ صبح ناشتے میں اتنی دیر
کر دیتی کہ اسے بھوکا دفتر جانا پڑتا ۔ شام کو بھی ناغہ کر دیا کرتی ۔ اس کے اچھے خاصے
قیمتی سوٹ مٹی میں گرا دیا کرتی اور پھر انتظار کرتی کہ اب وہ کچھ کہے گا اور اب،
لیکن بچی کے مرنے کے بعد سے تو اس کا لہجہ اور بھی نرم ہو گیا تھا ۔ وہ کوئی سخت
بات نہ کرتا ، ہاں کم سے کم بولتا اور زیادہ سے زیادہ الگ رہتا ۔
آج صبح جب وہ جانے کے لئے تیار ہو رہا تھا تو وہ پاس آ کر کھڑی ہو گئی ۔
" اب تمہارے ساتھ زندگی گزارنا بڑی مشکل ہے ، سمجھے تم " ————
بڑے آرام سے بول رہی تھی ———— مجھے تم سے سخت نفرت ہے ، میں نے بہت
دن تمہیں برداشت کیا مگر یہ ناممکن ہے ، میں جا رہی ہوں ————
مجھے تم سے سخت نفرت ہے ، اوہ ۔ سخت نفرت ، تم میرا کچھ بھی نہیں کر سکتے ۔
میں جاؤں گی " ۔ وہ اچانک ایک دم تیز ہو گئی ۔ اس کا شوہر چند منٹ تک اسے
سکتے تک کے سے عالم میں دیکھتا رہا ۔ اور پھر کوٹ اتار کر کرسی پر لیٹ گیا ۔
" کیا واقعی تم جانا چاہتی ہو ؟ "
" ہاں ! ہاں ! " اس نے بڑے غرور سے اپنے شوہر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال
دیں ۔ وہ اسے ملامت سے دیکھ رہا تھا ۔ وہ اس طرف سے مڑ کر دروازے کی
طرف بڑھنے لگی ۔
" میں تمہارا کچھ بھی نہیں لے جا رہی ہوں " باہر جانے سے پہلے اس نے پلٹ

کر کہا۔ اس کا شوہر بازوؤں میں منہ چھپائے ہوئے تھا۔

اماں نے جب اسے دیکھا تو سینہ کوٹ لیا۔ وہ وہاں سے کچھ کہے بغیر واپس آ گئی۔ ہمدرد اور محبت کرنے والی خالہ نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ مگر ابھی وہ اچھی طرح ٹکنے بھی نہ پائی تھی کہ خالہ زاد بھائی کے دل میں عشق کا تیر پیوست ہو گیا۔ ایک دن اس نے سب کی نظریں بچا کر اتنے زور سے آنکھ ماری کہ اسے ساری دنیا اس کی آنکھ کی طرح محدود ہوتی معلوم ہونے لگی ——— چھی! کیا وہ اسی لئے گھر سے نکلی ہے۔ قطعی نہیں۔ وہ اپنی زندگی بنانے، اپنے پیروں پر کھڑے ہونے اور ایک نفرت انگیز شخص کی روٹیوں سے بچنے کے لئے گھر چھوڑ کر آئی ہے ———
وہ اسی روز وہاں سے چلی آئی اور پھر چچی کے ہاں پناہ لے لی۔ چچی نے یہ تو نہ کہا کہ چلی جائے مگر ہر وقت سمجھاتی کہ خود اس کی بچی اپنے میاں کی جوتیاں تک کھاتی ہے اور زندگی بسر کرتی ہے۔ وہ بھی اپنے گھر جا کر بیٹھے ———

وہ یہ سب کچھ سنتی اور بڑی خاموشی سے اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کی جدوجہد کرتی رہتی ——— اس نے بہت سے چھوٹے بڑے اسکولوں کی خاک چھانی مگر کسی نے بھی تیس پچیس روپے سے زیادہ کی ٹھمری نہ سنائی۔ رہنے کی کوئی جگہ نہیں، کھانے کا کوئی انتظام نہیں۔ پھر اس نے اور آگے بڑھنا چاہا۔ مگر خالہ زاد بھائی کی آنکھ نے ہزاروں آنکھوں کو ہر طرف جنم دے رکھا تھا۔ وہ آنکھیں اس سے ہنس ہنس کر کہہ رہی تھیں۔ یہاں عورتوں کو یہی کچھ ملتا ہے۔ آؤ تم بھی لے لو ——— شام کے جھٹپٹے میں تانگہ بڑے مزے مزے چل رہا تھا۔ ہر طرف رونق اور چہل پہل تھی۔ مگر وہ تانگے میں یوں سر جھکائے بیٹھی تھی۔ جیسے وہ مر چکی

ہے اور کسی سے تے باندھ کر بٹھا دیا ہے۔ اس کا چہرہ سرد تھا اور ذہن منوں بوجھ تلے دبا سسک رہا تھا۔ اس وقت وہ نہ کچھ سوچ رہی تھی اور نہ دیکھ رہی تھی۔

جب وہ تانگے سے اتری تو خاصہ اندھیرا ہو چکا تھا۔ گھر کے دروازے بھڑے ہوئے تھے۔ وہ انہیں آہستہ سے کھول کر کاٹھ کی پتلی کی طرح اندر داخل ہو گئی۔ سامنے صحن میں اس کا شوہر بستر لیٹا کسی کتاب کی ورق گردانی کر رہا تھا۔ اس نے چونک کر اسے حیرت سے دیکھا اور پھر اس کی آنکھوں میں نفرت کا ایک طوفان ٹھاٹھیں مارنے لگا۔

"تم یہاں کیوں آئیں؟" اس کا لہجہ خبیث بڈھے کی طرح کھرا تھا۔

"مجھے تم سے محبت ہے" وہ اس کے پلنگ کے قریب کھسک گئی۔ "میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔ اس کے پاؤں آپ ہی آپ پیچھے کی طرف اٹھنے لگے۔ لیکن پھر وہ ٹھٹھک سی گئی اور پاس ہی پڑی ہوئی کرسی پر ہونٹ کھول کر بے جان سی لیٹ گئی۔ اس کا چہرہ جذبات سے بالکل خالی تھا۔

جھینپ

ابھی ذرا دیر پہلے خوب بادل گرجے تھے۔ بجلی رہ رہ کر چمکی تھی۔ اور اب ابر کے چھوٹے بڑے سیاہ ٹکڑے ہوا میں ایک دوسرے کے پیچھے بھاگے" پھر رہے تھے۔ گڑھے دار سڑک پر جگہ جگہ پانی بھرا ہوا تھا۔ جس پر ٹانگہ بڑی بے بسی سے دھچر دھچر کرتا ہوا اچل رہا تھا اور خاتون ہچکولے کھاتے ہوئے اپنی مرنے والی دادی اماں کے لئے سوچ سوچ کر رو پڑنے کی کیفیت طاری کرنے کی کوشش کر رہی تھی ——— ہے ہے بیچاری دادی اماں ——— آبا کو تو خیر اس لئے چاہتی تھی کہ اپنا خون چُسا چُسا کر پالا تھا۔ مگر اسے بچپن ہی سے کس قدر چاہتی تھی۔ راتوں کو اسے اپنے پاس لٹا کر راجہ بھوج اور گنگوا تیلی کی کہانی دو مہینوں میں گا کر سنائی۔ جب وہ روئی تو سب بچوں سے چھپا کر اسے گھی شکر کے بڑے بڑے نوالے

کھلائے اور اس کے ضد کرنے پر اسے اکثر اپنے موٹے شیشوں والی عینک بھی پہننے کو دے دی. کیا مجال جو کوئی دوسرا بچہ ان کی عینک ایک ذرا دیر کو بھی لے لے۔ عطو اور رضو اس کی حرص میں عینک کے لئے کیسا کیسا مچلتیں مگر دادی اناّ کے کان پر جوں تک بھی نہ رینگتی۔ آخر وہ بھی تو اس کی طرح بچہ تھیں. لیکن انہیں محبت ہی نہ تھی کسی دوسرے بچے سے. بس اس پر جان چھڑکتی تھیں۔ ——————

اوہ—— وہی تو بچپن کی محبت تھی کہ دادی اناّ ابا کے مرنے کے بعد اس کے ہاں سے چلی گئیں. پھر کبھی بھی نہ آئیں۔ مگر مہینے میں ایک آدھ بار اس کی خیریت ضرور پچھوا لیتیں —— بیچ —— بیچاری دادی اناّ، اس کے نام کا کلمہ پڑھتی ہوئی مر گئیں —— کاش! کوئی اسے اطلاع دے دیتا کہ تمہاری دادی اناّ کا آخری وقت ہے۔ وہ تمہیں یاد کر رہی ہیں. تو کتنا اچھا ہوتا۔ وہ اس وقت ——! تانگے کا پہیہ ایک بڑے سے گڑھے میں دھچ سے جا گرا —— اور کیچڑ لے پانی کا ایک چھپا کا خاتون کے ریشمی سیاہ برقع پر آپڑا۔

"اوہ! بھیا لگا تو زور —— تانگے والے نے چابک ہوا میں لہرا کر سڑاک سے بجائی تو مریل ٹٹو نے ایک جھٹکے کے ساتھ تانگے کے پہیے کو گڑھے سے نکال لیا اور پھر جیسے پھونک پھونک کر قدم رکھنے لگا ——————

کتنی دیر سے تانگہ یوں ہی دھچر دھچر کرتا ہوا چل رہا تھا. لیکن گڑھے دار سڑک کسی طرح ختم ہونے نہ آتی۔ جانے کتنے موڑ آئے اور گزر گئے مگر خاتون کے خیالات کا سلسلہ کئی بار ٹوٹ ٹوٹ کر پھر جڑا مگر دادی اناّ کا گھر نہ آنا تھا نہ آیا۔

اور خاتون جو اتنی دیر سے دادی اماں کے لئے سوچ سوچ کر رونے کی کوشش کر رہی تھی۔ اب ریشمی برقع پر کیچڑ کی پھٹکیاں دیکھ کر غصّے کی ہلکی ہلکی جھنجھناہٹ اپنی رگوں میں محسوس کرنے لگی ـــــ بھلا کیا پڑی تھی اس برسات کی رات میں دادی اماں کو روتے آنے کی ـــــ اماں نے کہا بھی تھا کہ صبح چلی جانا گھڑی بھر کو پرسے کے لئے ـــــ مگر وہ ایسی کہ جہاں سُنا کہ دادی اماں نے مرنے سے پہلے اسے یاد کیا تھا۔ بس مارے فخر کے مر گئی اور جھٹ سے چلی آئی اس گڑھے دار سڑک پر اپنے جسم کی چولیں ڈھیلی کرانے۔

" توبہ! یہ سڑک ہے کہ ـــــ خاتون جانے اور کیا کہتی کہ نیاز محمد نے اس کی بات کاٹ کر لفظ بہ لفظ وہی باتیں دہرائیں جنہیں وہ کئی بار کہہ چکا تھا۔" کہ نانی نے آپ کو مرنے سے پہلے یاد کیا تھا، آپ کے نام کی ایسی رٹ لگا رکھی تھی کہ کلمہ تک پڑھنا یاد نہ رہا ـــــ نیاز محمد نے ایک ٹھنڈی آہ بھری۔ خاتون یہ دیکھ کر خود بھی رونے کے موڈ میں آنے لگی۔ اوہ! بیچاری دادی اماں کی موت نے ان سب کے دلوں پر کیا اثر کیا ہوگا کس قدر محبت کرنے والی تھیں۔ مرنے سے پہلے بجائے خدا کے اسے یاد کرتی ہوئی مریں۔ اوہ ـــــ اوف! مارے احساس برتری کے خاتون کی آنکھوں میں دو گرم گرم آنسو بھر گئے اور اس کا جھکا ہوا سر جیسے تانگے کی چھت سے لگ گیا۔

دھچر دھچر کرتا ہوا تانگہ ایک گز بھر چوڑی گلی کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ جس کے بالکل قریب سڑک کے کنارے نانبائی کی دکان میں ایک کالا کلوٹا آدمی

سرخ لنگوٹ کسے دھپا دھپ تنور میں روٹیاں لگا رہا تھا۔ کچھ لوگ وہیں زمین
پر اکڑوں بیٹھے بڑے بڑے نوالے ٹھونس رہے تھے۔ لمبی ڈاڑھی والا نانبائی چولہے
پر رکھے ہوئے بڑے سے بدقلعی پتیلے میں جھانک کر مٹی کے پیالوں میں سالن نکال
رہا تھا اور دوکان کے بالکل سامنے لوہے کی سلاخ میں لٹکا ہوا دولویں دینے والا
چراغ دھندلی روشنی کے ساتھ دھوئیں کے بادل اگل رہا تھا۔ خاتون نے اپنے
گردو پیش ایک گہری نظر ڈالی اور پھر برقع سنبھالتی تانگے سے اتر آئی۔ پرس کھول
کر تانگے کا کرایہ ادا کیا اور جیسے ہی نیاز محمد کے پیچھے گلی میں داخل ہوئی۔ بدبو کا ایک
دماغ چکرا دینے والا بھبکا اس کی ناک میں گھس گیا۔ خاتون کو مارے کراہت کے
دو تین جھرجھریاں آگئیں وہ پیچ در پیچ گلیوں میں تیزی سے چلنے کی کوشش کرنے
لگی۔ مگر بدبو بھی اس کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی جیسے دو طرفہ اُبلتی نالیوں
میں کیچڑ اور پانی کی سرسراہٹ کے ساتھ مینڈک زور زور سے ٹرٹرا رہے تھے۔
مارے بدبو کے خاتون کو اپنا دماغ پھٹتا ہوا محسوس ہونے لگا
"کتنی دور ہے گھر ؟"
"بس اب آیا چاہتا ہے۔" نیاز محمد نے مڑ کر جواب دیا اور پھر جلدی جلدی
قدم اٹھانے لگا ———— گلی کے موڑ پر تہبند باندھے دو آدمی کھڑے باتیں کر
رہے۔ "بڑا بُرا زمانہ لگا ہے، ہر وقت جان کا خطرہ رہتا ہے۔ بے چارے غریبوں
کی مصیبت ہے" "ہاں! کیا وقت ہے کبھی کیا بھائی چارہ تھا۔ اب تو ہندو مسلمانوں
کو بھوسنے کھاتے ہیں اور مسلمان ہندوؤں کو، واہ ری آزادی کی لگن کہ بھائی
بھائی کا خون بہا رہا ہے۔"

چھوڑ و یار۔ ہم تو یہ جانتے ہیں کہ ——— " خاتون نے ان دونوں سے بچ کر آگے نکلنا چاہا تو ایک نے اپنا تہبند سمیٹ کے ایک بھیانک گالی بک کر جیسے برے زمانے کی مزید تائید کردی۔ خاتون بوکھلا کر جلدی سے آگے بڑھ گئی۔ کسی مکان میں ایک عورت بڑی کراہی آواز میں رو رو کر خوفناک گالیاں بک رہی تھی :" ارے' ارے' دھم۔ دھم " اور ساتھ ہی کوئی جیسے کسی ملائم چیز پر قوت آزمائی کر رہا تھا۔ ——— نیاز محمد کے قدم تیز ہو گئے اور پھر وہ ایک مکان کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ جہاں گلی کچھ چوڑی ہو گئی تھی۔ مکان کے سامنے نالیوں کے دونوں طرف دو پتلی پتلی بانس کی کھاٹیں پڑی ہوئی تھیں جن پر چھ سات آدمی بیٹھے حقہ پی رہے تھے اور نیاز محمد کا باپ سر تھامے ان سب کے بیچ میں بیٹھا تھا۔ خاتون کے پہنچتے ہی سب اسے گردنیں اچکا اچکا کر دیکھنے لگے۔

" ارے سب لوگ ذرا منہ پھیر لو " نیاز محمد کے باپ نے کہا اور سب نے اپنے منہ اِدھر اُدھر کر لئے۔

" اندر آ جیئے بجیا " نیاز محمد نے کہا اور اینٹوں کی تین سیڑھیاں چڑھ کر جلدی سے اندر ہو گیا۔ وہ بھی اس کے پیچھے اندر چلی گئی ——— پتلی لمبی ڈیوڑھی میں ایک چندھی سی لالٹین جیسے سوگ منا رہی تھی؛ کسی کونے میں چھپا ہوا جھینگر بین کر رہا تھا اور بس ہر طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔

" اماں! بجیا کو لے آیا " نیاز محمد نے ٹاٹ کے پھٹے ہوئے پردے میں منہ ڈال کر اس طرح کہا جیسے اس سے بڑا کارنامہ انجام دیا ہو۔

" ہائے میری ماں ——— نیاز محمد کی بات ختم ہونے کے ایکدم ہی سے

لبد گھر کے اندر ایک بھیانک چیخ بلند ہوئی اور خاتون بھٹے ہوئے ٹاٹ کی سِتلیوں
میں الجھ کر رہ گئی۔ پھر سنبھلتی ہوئی اندر چلی گئی ——— چھوٹے سے دالان
میں سامنے کے طاق پر جلتے ہوئے چراغ کی اداس روشنی میں اس کی پہلی نظر
اس کھاٹ پر پڑی جس پر دادی انا کی لاش میلی چادر سے ڈھکی پڑی تھی۔
سرہانے کرچھے میں لوبان سلگ رہا تھا، کھاٹ کے اردگرد زمین پر دس بارہ عورتیں
بیٹھی ہوئی تھیں اور نیاز محمد کی ماں پٹی سے سر ٹیکے بین کر رہی تھی ——— ہائے اماں
——— کچھ تو بولو ——— میں اماں کہہ کر کسے پکاروں گی ———
ہائے ایک بار تو بول دو ——— دیکھو تمہاری لاڈلی گود دوں کی کھلائی پوتی
آئی ہے ——— آنکھیں کھولو ——— ہائے ——— نیاز محمد کی ماں
جانے اور کیا کیا کہہ رہی تھی۔ خاتون کو کچھ بھی نہ سنائی دیا۔ وہ موت کا گھر اپنے
ہوش میں دوسری بار دیکھ رہی تھی اور اسے محسوس ہو رہا تھا کہ دادی انا کی
موت کا یہ صدمہ اس کے لئے بڑا سخت ہے۔ اس کا جی گھٹا جا رہا ہے۔ ڈوبا جا
رہا ہے۔ اس کا جی چاہتا کہ وہ خوب چیخ چیخ کر رونے لگے اور دوڑ کر دادی
انا کی لاش سے لپٹ جائے۔ ان کا منہ کھول دے، ان کے سرد ہونٹ چوم
لے اور ان سے کہے کہ تم نے مجھے یاد کیا تھا، دیکھو میں آگئی، اب یوں آنکھیں بند
کئے چپ چاپ کیوں پڑی ہو، میری اچھی دادی انا ——— لیکن
خاتون یہ سب کچھ نہ کہہ سکی، اس کے دل میں اچانک پیدا ہونے والے بپھرے
دل جذبات کو پلنگ کے گرد بیٹھی ہوئی عورتوں کی اشتیاق بھری نگاہوں نے منتشر
ہونے سے پہلے ہی جکڑ دیا اور وہ اپنی جگہ پر اس طرح چپ چاپ بیٹھی رہی

بعد گھر کے اندر ایک بھیانک چیخ بلند ہوئی اور خاتون پھٹے ہوئے ٹاٹ کی سسکیوں میں الجھ کر رہ گئی۔ پھر سنبھلتی ہوئی اندر چلی گئی ——— چھوٹے سے دالان میں سامنے کے طاق پر جلتے ہوئے چراغ کی اداس روشنی میں اس کی پہلی نظر اس کھاٹ پر پڑی جس پر دادی اناّ کی لاش میلی چادر سے ڈھکی پڑی تھی۔ سرہانے کرچھے میں لوبان سلگ رہا تھا، کھاٹ کے اردگرد زمین پر دس بارہ عورتیں بیٹھی ہوئی تھیں اور نیاز محمد کی ماں پٹی سے سر ٹیکے بین کر رہی تھی ——— ہائے اماں ——— کچھ تو بولو ——— میں اماں کہہ کر کسے پکاروں گی ——— ہائے ایک بار تو بول دو ——— دیکھو تمہاری لاڈلی گودوں کی کھلائی پوتی آئی ہے ——— آنکھیں کھولو ——— ہائے ——— نیاز محمد کی ماں جانے اور کیا کیا کہہ رہی تھی۔ خاتون کو کچھ بھی نہ سنائی دیا۔ وہ موت کا گھر اپنے ہوش میں دوسری بار دیکھ رہی تھی اور اسے محسوس ہو رہا تھا کہ دادی اناّ کی موت کا یہ صدمہ اس کے لئے بڑا سخت ہے۔ اس کا جی گھٹا جا رہا ہے۔ ڈوبا جا رہا ہے۔ اس کا جی چاہتا کہ وہ خوب چیخ چیخ کر رونے لگے اور دوڑ کر دادی اناّ کی لاش سے لپٹ جائے۔ ان کا منہ کھول دے، ان کے سرد ہونٹ چوم لے اور ان سے کہے کہ تم نے مجھے یاد کیا تھا، دیکھو میں آگئی، اب یوں آنکھیں بند کئے چپ چاپ کیوں پڑی ہو میری اچھی دادی اناّ ——— لیکن خاتون یہ سب کچھ نہ کہہ سکی، اس کے دل میں اچانک پیدا ہونے والے بیچے دل جذبات کو پلنگ کے گرد بیٹھی ہوئی عورتوں کی اشتیاق بھری نگاہوں نے منتشر ہونے سے پہلے ہی جکڑ دیا اور وہ اپنی جگہ پر اس طرح چپ چاپ بے سدھ

سی کھڑی رہ گئی ، جیسے اس کے پاؤں زمین میں کیل دیئے گئے ہوں ۔
ہائے میری اماں ! نیاز محمد کی اماں جب بین کرتے کرتے تھک گئی
تو ایک دم سسکیوں اور ہچکیوں کی گاڑی پوری رفتار سے چل پڑی ۔ مارے
ہچکولوں کے اس کا بُرا حال ہونے لگا ۔ پلنگ کے گرد بیٹھی ہوئی عورتوں نے
اسے سنبھالنے کی کوشش کی لیکن اس نے تو جیسے اپنی ماں کے پلنگ کی پٹی نہ
چھوڑنے کی قسم کھا رکھی تھی اور وہ قسم اس وقت ٹوٹی جب خاتون نے آگے بڑھ
کر ہچکچاتے ہوئے اس کا سوکھا بازو پکڑ کر ہٹایا اور اس نے پٹی چھوڑ کر اپنا
سر خاتون کے شانے پر رکھ دیا ۔ چراغ کی روتی بسورتی روشنی میں خاتون کو نیاز محمد
کی ماں کا چہرہ بڑا ہی گھناؤنا اور بھیانک لگا ، کالی ، سوکھی ہوئی بڑی بڑی ابھری
ہوئی آنکھیں جن میں آنسوؤں کے موٹے موٹے قطرے رس رہے تھے ۔ پھر اس کے
بڑے بڑے دانت آنسو رخساروں کی ابھری ہوئی ہڈیوں پر ایک لمحے کو رکتے اور
پھر ڈھلک کر ہونٹوں پر سے ہوتے ہوئے دانتوں میں سما جاتے ۔ نمکین نمکین
آنسوؤں کو پینے کے خیال ہی سے خاتون کو متلی سی ہونے لگی ۔ اس کا جی چاہا کہ
وہ نیاز کی ماں کا سر اپنے کاندھے سے جھٹک دے ۔ لیکن وہ ایسا نہ کر
سکی ۔ وہ بھلا اس کا سر کیسے ہٹا سکتی تھی جس کی ماں مر گئی تھی اور جس نے
اس کے شانے کا سہارا لیا تھا ۔ اس نے اپنی نظریں نیاز محمد کی ماں پر سے ہٹا
کر دادی انّا کی لاش پر گاڑ دینا چاہیں ۔ مگر میت کے اردگرد بیٹھی ہوئی ان
عورتوں میں اس کی نظریں الجھ الجھ کر رہ جاتیں جو اسے اشتیاق اور للچاہٹ
سے دیکھ رہی تھیں ۔ سوکھی مرجھلی ٹیے تی تا شاموٹی ، کالی پیلی اور شلجم کی طرح پھیکی عورتیں ۔

جن کے گندے گندے لباس چراغ کی بسورتی ہوئی روشنی میں اور بھی گندے نظر آرہے تھے۔ اسے ان عورتوں کے یوں دیکھنے سے الجھن سی ہونے لگی تو اس نے ان سب کی طرف سے منہ پھیر کر سنسے چوکور صحن کو یوں ہی دیکھنا شروع کر دیا۔ پورے صحن میں چراغ کی مدھم روشنی رینگی ہوئی تھی۔ بیچ میں جھلنگا کھاٹ پڑی تھی جس کے بان زمین پر جھولن کی طرح رکھے ہوئے تھے اور صحن کے ایک کونے میں لگے ہوئے نل سے بہتی ہوئی پانی کی پتلی سی دھار پکی زمین پر جیسے گنگنا رہی تھی ـــــــ ہائے اماں ـــــــ خاتون کے شانے پر اچک کر نیاز محمد کی ماں نے ایک چیخ کے ساتھ پھر رونا شروع کر دیا۔ خاتون نے منہ موڑ کر دیکھا تو نیاز محمد کی ماں بڑی بے بسی سے رو رہی تھی۔ ایکھا ایسی بے لبی جیسے یہ ماں کی موت کے رنج سے زیادہ کوئی اور ہی رنج شریک معلوم ہو رہا تھا۔ مگر کیا۔؟ خاتون یہ سوچ بھی نہ سکی۔ عورتیں اسے اسی طرح للچاہٹ سے دیکھ رہی تھیں۔ ـــــــ دادی اماں کی میت ـــــــ نیاز محمد کی ماں کی بے بسی اور عورتوں کے مسلسل دیکھتے رہنے کی ملی جلی کیفیت نے اس کی آنکھوں میں مارے الجھن کے گرم گرم آنسو بھر دیے۔ آہ ـــــــ ہائے ـــــــ نیاز محمد کی ماں روئے جا رہی تھی۔ خاتون نے بھری بھری آنکھوں سے دیکھا کہ اب بھی عورتیں چپ چاپ بیٹھی اسے اشتیاق سے دیکھ رہی ہیں۔ نیاز محمد کی ماں کی طرف ان کی ذرا بھی توجہ نہیں۔ ہائے اللہ ـــــــ وہ جی ہی جی میں الجھی۔ جانے کم بختیں ایسے مریکبوں کی طرح کیوں دیکھے جا رہی ہیں۔ خاتون نے سوچا اور پھر اسے ایک دم اپنی کلاس فیلو کلثوم کا خیال آ گیا۔ کالی بدصورت کلثوم جو

بے حد عزیب ہمی اور حبس کی فیس صاف تھی اور جسے کبھی کسی نے اچھا بہت صاف لباس پہنے نہ دیکھا تھا۔ اسکول میں اسے کوئی لڑکی منہ بھی لگانا پسند نہ کرتی اور کلثوم رنگ برنگ کے لباسوں میں پھر کتی، تھر کتی خوبصورت خوب صورت لڑکیوں کو اشتیاق اور للچاہٹ سے دیکھا کرتی۔ بالکل اسی طرح جیسے میت کے گرد بیٹھی عورتیں دیکھ رہی تھیں اور پھر اس خیال کے بعد اسے فوراً احساس ہوا کہ وہ یقیناً اس انداز میں بہت خوبصورت لگ رہی ہوگی۔ ایک حور جو ارضی مصیبتوں پر رونے آگئی ہو۔ خاتون نے اپنے چہرے کو اور بھی غمناک بنا لیا۔ پھر وہ تصور ہی تصور میں اپنے سوگوار حسن کو محسوس کرنے لگی۔ چڑھی چڑھی آنکھوں میں تیرتے ہوئے بڑے پیارے انداز میں موہوم طریقے پر کپکپاتے ہوئے لب، کسی قدر اوپر کو اٹھا ہوا چہرہ، خوبصورت چمپئی گردن میں لپٹا ہوا شفون کا سفید دوپٹہ اور گھٹنے اس طرح زمین پر ٹیکے ہوئے جیسے کوئی معصوم دوشیزہ قربان گاہ کے سامنے دعا مانگ رہی ہو۔ حسن کے اس تصور نے اسے روتے ہوئے نحوست زدہ ماحول سے اڑا کر ایک دم کسی آرٹسٹ کا موڈل بنا دیا۔ دادی اماں کا جنازہ اور رونے والے سب پس منظر میں کھو کر رہ گئے۔

"مت رو بیٹیا۔ تمہاری دادی اماں کی روح بے چین ہوگی"۔ نیاز محمد کی ماں نے سسکیوں کے درمیان کہا اور دو تین عورتوں نے جلدی سے اس کی تائید کر دی۔ آرٹسٹ کا موڈل پھر نحوست زدہ ماحول میں آگرا۔

پھول جیسا چہرہ کملا کر رہ گیا"۔ ایک عورت نے اپنے پائینچے سنبھالتے ہوئے کہا۔ ہاں ہاں بالکل۔۔ ارے نیاز کی اماں صاحبزادی کو اچھی طرح بٹھاؤ، کب سے

زمین پر بیٹھی ہیں۔ دوسری عورت نے اپنے ہونٹوں پر پان کی لالی ملتے ہوئے کہا

" اور دیکھو اب بھی رونا دھونا مت، صاحبزادی کا جی تھوڑا ہوگا "

اسی عورت نے کہا اور پھر پان چبانے لگی۔ نیاز محمد کی ماں نے ایک سانس سے کر جیسے سارے اندوہ کو چراغ کے دھوئیں میں گھل مل جانے کے لئے اگل دیا اور خاتون کا جی چاہا کہ وہ چیخ چیخ کر روئے۔ اپنے بال بکھرائے۔ نیاز محمد کی ماں کی طرح سینہ کوٹے، زمین پر پچھاڑیں کھائے اور پھر ان سب عورتوں کو اپنے لئے اور بھی پریشان دیکھے جو اس کا چہرہ اتر جانے پر اتنی بہت سی باتیں کر گئی تھیں۔ لیکن اس سے قبل کہ وہ رو پڑنے کی کوشش کرتی۔ نیاز محمد کی ماں نے سوکھا ہوا بڑا سا ہاتھ اس کے ملائم بازو میں پہنا دیا۔

" بیٹا یہاں سے اٹھ کر پلنگ پر بیٹھو " خاتون نے ہلکی سی مزاحمت میں اپنا ہاتھ کھینچا۔ " ارے کون نہیں جانتا کہ تمہیں اپنی دادی اناّ سے حد سے محبت تھی مگر کب تک اپنا آرام حرام رکھو گی۔ چلو، اٹھو " نیاز محمد کی ماں نے ہلکے سے اس کا ہاتھ کھینچا تو وہ ایک ایسی چیخ کے ساتھ رو پڑی جس میں نہ غم تھا، نہ خوشی روتے روتے اس نے اپنا سر دادی اناّ کی کھاٹ کی پٹی سے پٹک دیا۔

" ارے۔ ارے۔ ارے۔ رے۔ نانا بیٹا " کئی سخت سخت خنکی ہاتھ اس کی طرف لپک پڑے۔ اور سرسراتے ہوئے کپڑوں سے آتی ہوئی برساتی بو اس کے نتھنوں میں گھس گئی۔ خاتون نے گھبرا کر سر اٹھایا۔ وہ عورتوں کے بیچ میں گھری ہوئی تھی۔ بدبو اور عورتوں کے جمگھٹے سے اس کا دم گھٹنے لگا تو وہ ایک دم کھڑی ہو گئی اور نیاز محمد کی ماں نے اسے بیماروں کی طرح

سہارا دے کر دالان کے کونے میں پڑی ہوئی کھاٹ پر بٹھا دیا۔ پر خود اس کے پاس ٹک کر پنکھا جھلنے لگی۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا میں خاتون نے آنکھیں موندھ لیں۔

"لیٹ رہو بیٹی" نیاز محمد کی ماں نے آہستہ سے کہا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر لٹانے لگی "نہیں۔ نہیں!" وہ سرہانے رکھے ہوئے میلے چیکٹ تکیے کے خیال ہی سے بیزار ہونے لگی۔ نیاز محمد کی ماں نے اسے اس طرح غور سے دیکھا جیسے وہ اس کی بیزاری تاڑنے کی کوشش کر رہی ہو۔

"ہاں! کون سے دل سے لیٹا جائے، دل میں تو آگ لگی ہے" پھر وہ آہستہ سے بولی اور خاتون سوچنے لگی کہ بھلا اسے دادی اناں سے محبت ہی کب تھی؟ وہ تو بس اس کی عزت کرتی تھی، اتنی زیادہ کہ اپنی پڑھی لکھی سہیلیوں میں بھی ان کا ذکر کیا کرتی، لیکن یہ سب کتنے معصوم ہیں کہ اس کے رونے پیٹنے کو محبت سمجھ رہے ہیں۔ بے چارے ——— پھر بھی اسے رونا چاہیے، ورنہ سب کیا کہیں گے؟ یہی کہ یہ اس دادی اناں کے جنازے پر آئی ہے جس نے مرنے سے پہلے کلمے کے بجائے اس کا نام رٹا ہے۔ واہ ری دنیا، خاتون کو اپنی ذات پر افسوس ہونے لگا، ساتھ ہی اس نے رونے کی کوشش کی مگر وہ بھی تو بغیر تیل کے چراغ جلانے کی کوشش کر رہی تھی۔ بس ہونٹ کپکپا کر رہ گئے۔ اور وہ نظریں جھکا کر چپ چاپ بیٹھی رہی ——— نیاز محمد کی ماں گھٹنوں میں سر چھپائے بے سدھ سی بیٹھی تھی۔ کبھی کبھی اس کا دبلا پتلا جسم ایک لمبی آہ سے لرز اٹھتا۔ محلے کی عورتیں بھی چپ بیٹھی تھیں، بس دہلیز میں چھپیا

ہوا جھینگر جیسے بین کر رہا تھا اور گاہے گاہے آہوں کے سراٹے دالان میں سرسرا اٹھتے۔ دیر تک یوں ہی خاموشی چھائی رہی۔ خاتون کو بیٹھے بیٹھے بے چینی اور تھکن ہونے لگی تو وہ سوچنے لگی تو سوچنے لگی کہ جانے کب اٹھیں گی دادی اناّ ــــــــ۔

رات ہوتی جا رہی ہے! بھلا وہ گھر کیسے پہنچے گی؟ یہاں تو رات کاٹنا بڑا مشکل کام ہے۔ گھٹن، گرمی اور پھر نیاز محمد کی ماں ساری رات روئے گی۔ مگر یہاں تو سب اس طرح مطمئن بیٹھے ہیں جیسے کہ بے چاری دادی اناّ خود ہی اٹھ کر نہا دھو لیں گی، کفن پہن لیں گی اور پھر خود ہی قبرستان چلی جائیں گی۔ عورتیں تو اطمینان سے بیٹھی آہیں بھر رہی ہیں ابھی، اور مردوں کی چلم شاید صبح تک تمباکو سے خالی نہ ہو، جانے کیا ہو رہا ہے۔

"میت کب اٹھے گی؟ اب تو کافی دیر ہو رہی ہے۔ خاتون نے فکرمندانہ لہجے میں پوچھا اور نیاز محمد کی ماں جواب دینے کے بجائے اسی طرح ایک دم پھوٹ کر رو پڑی۔ جیسے خاتون نے اس کا کلیجہ نوچ لیا ہو "ہے۔ ناحق ہی تو پھر دادی اناّ کی یاد دلا کر بیچاری کو رُلا دیا ــــــــــــ خاتون نے شرمندہ ہو کر اپنا سر جھکا لیا۔ نیاز محمد کی ماں تھوڑی دیر تک رو چکنے کے بعد ہچکیوں اور سسکیوں کے درمیان کہنے لگی "جب اٹھیں ــــــــ نیاز و کے ابا محلے بھر سے قرض مانگ آئے، کہیں سے نہ ملا۔ اب جج صاحب کے بنگلے پر اور جائیں گے، اگر کون سنتا ہے نوکر کی۔ اب تو ایک پیسہ بھی شاید ہی دے۔ علاج معالجے کے لئے ایک مہینے کی پیشگی تنخواہ دے چکا ہے۔ ہائے رے اب تو یہ لاش چندے سے اٹھے گی بیٹا، یا پھر پڑے پڑے سڑ جائے۔ ہائے اماں

—————— " نیاز محمد کی ماں پھر رونے لگی ۔

ارے کیوں روتی ہو نیازو کی اماں ہم غریبوں کا بھی خدا ہے ۔ کچھ تو کرے گا ۔ ہم سب تمہارے ہی جیسے حال میں ہیں ، ورنہ بھلا محلے ٹولے کے لوگ ایسے وقت میں بھی کام نہ آئیں جو دس پانچ بھی پڑے ہوں پاس تو کفن پر اٹھیں " ۔ ایک عورت نے کہا ۔ اور دس پانچ میں ہوتا کیا ہے ، اس زمانے میں تیس چالیس چاہئیں تیس چالیس " دوسری عورت آہوں اور سسکیوں سے الجھی ہوئی فضا میں محروم محروم نظروں سے دیکھنے لگی ۔ دوسری عورتیں اپنی اپنی مصیبتوں کا ذکر کر رہی تھیں ۔ پیٹ کو روٹی ہے نہ تن کو کپڑا —————— اور پھر وہ سب کی سب امید بھری نظروں میں خاتون کی طرف دیکھنے لگیں ۔ ایسی امید بھری نظریں جو چیخ رہی تھیں کہ تم ضرور اپنی دادی انا کے کفن کا انتظام کر سکتی ہو ۔ تم بڑی آدمی ہو ، تم ریشمی کپڑے پہنے ہوئے ہو ، تمہارے ہاتھ میں بڑا سا بٹوہ ہے ، اور پھر تمہیں اپنی دادی انا سے محبت بھی ہے —————— خاتون نے ان نظروں کو دیکھا ۔ پہچانا اور سوچنے لگی کہ اب کیا کرنا چاہیئے ۔ ابھی وہ ہے کس قابل ۔ یہ سب اسے نہ جانے کیا سمجھ رہی ہیں ۔ جیب خرچ سے وہ صرف پچاس روپے بچا سکی ہے ۔ اتنے دنوں میں اور پھر اس نے کب سے سلمہ سے کہہ رکھا ہے کہ وہ اس کے لئے اپنی جیسی ساری خرید دے ۔ پورے تیس روپے اسے دینا ہیں ۔ پانچ روپے چلے کے چندے کے ، اگر اس نے یہاں تیس چالیس دے دئے تو پھر اماں تو اسے اتنے روپے اکٹھے دینے سے رہیں ۔ ویسے ہی اسے فضول خرچ کہا کرتی ہیں ۔ دادی انا جب بھی اس کی خیریت

پچھوایا کرتی تھیں اور وہ انہیں اپنی جیب سے پانچ چھ روپے بھجوا دیا کرتی.
تو اماں کتنی ناراض ہوتی تھیں ۔ خاتون تو خیریت پچھوانے پر چلپھلا جاتی ہے۔
تمہاری دادی انا کبھی ہماری خیریت نہیں پوچھتیں. خاتون روپے جو دیتی ہے،
میں کہتی ہوں کہ کوئی ضرورت نہیں ایک پیسہ دینے کی۔ ان کی خدمات
کا کیا کچھ کم صلہ دیا جا چکا ہے ؟ اب جو اماں کو معلوم ہوگا کہ وہ ایک دم
اتنے بہت سے روپے دے بیٹھی تو کس قدر ناراض ہوں گی ـــــــ
خیر ناراضگی کی ایسی کیا پروا مگر سلمہ کیا کہے گی کہ دس بار کہا ساری خرید لو خرید لو
اور روپے نہ نکلے جیب سے ـــــــ اب کیا ہو آخر ـــــــ خاتون
نے اٹھ کر عورتوں کی طرف دیکھا تو وہ سب اسے اس طرح جیسے وہ کوئی جادو کا
پٹارہ ہو، جس میں سے کوئی بہت ہی عجیب چیز نکلنے والی ہو. خاتون پھر سوچنے
لگی ـــــــ اگر اس وقت وہ دادی انا کی میت اٹھوا دے تو ان سب
عورتوں کو کتنی حیرت ہو گی اور یہ روتی ہوئی نیاز محمد کی ماں کس قدر احسان
مانے گی ـــــــ احسان توبہ! توبہ !! خاتون کانپ پر پھسلتے پھسلتے بچی ـــــــ
احسان کاہے کا. یہ تو اس کا فرض ہے کہ وہ اس دادی انا کی لاش اٹھوا دے جو
اسے عزیز رکھتی تھی. جنہوں نے مرنے سے پہلے کلمے کے بجائے اس کے نام کی رٹ
لگا دی تھی. وہ ان کی کچھ بھی تو خدمت نہ کر سکی ۔ وہ ان کی محبت کا بدلہ کسی طرح
تو نہ دے سکی، کاش ! وہ بیماری ہی میں ان کی تیمارداری کر لیتی. لیکن
اس کی تو قسمت ہی میں نہ تھا. پھر بھی اب وہ اس آخری کام کو انجام دے سکتی ہے۔
وہ ساری پھر خرید لے گی، وہ اماں کی کڑوی باتیں بھی برداشت کرے گی مگر یہ روپے

دادی اماں کی سبھی الفت پر مزید قربان کرے گی۔ آہ! بیچاری۔ خلوص و محبت کے اچانک پیدا ہونے والے جذبات نے اس کی آنکھوں میں گرم گرم آنسو بھر دئے۔

"نیاز محمد کی اماں" اس نے نیاز محمد کی ماں کا ہاتھ چھو کر چپکے سے پکارا۔ "ہاں بٹیا!" وہ اس کی طرف دیکھنے لگی۔

"یہ لو ——" وہ پرس کھول کر روپے نکالنے لگی —— "

یہ لو جلدی سے انتظام کر لو —— خاتون نے دس دس روپے کے تین نوٹ اس کے ہاتھ پر رکھ دئے۔ اگر اور ضرورت پڑے تو مانگ لینا۔ ہماری دادی اماں سے زیادہ عزیز نہیں ہے روپیہ —— نیاز محمد کی ماں نوٹوں کی مٹھی میں دبائے اسے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہی تھی۔ جیسے اسے یقین نہ آرہا ہو۔ کہ خاتون نے اسے اتنے بہت سے روپے دئے ہیں۔ سچ مچ کیا وہ اپنی ماں کی اس لاش کو اٹھوا سکتی ہے جو صبح سے پڑی تھی۔ اور اس کے شوہر کو کہیں سے قرض نہ ملا تھا اور نہ ملنے کی امید تھی۔

ہائے اماں —— خاتون کو دیکھتے دیکھتے وہ پھر چیخ کر رو پڑی۔ اور دیوانہ وار اٹھ کر اپنی ماں کے پلنگ کی پٹی سے لپٹ گئی۔

"یہ لو —— اس نے نوٹ میت پر پڑی ہوئی چادر پر بکھیر دئے۔"

یہ لو تمہاری لاڈلی پوتی نے تمہاری لاش اٹھوانے کا انتظام کر دیا۔ نہیں تو تمہاری لاش چندے سے اٹھتی۔ یا پھر سڑ جاتی۔ تمہاری لاش پڑے پڑے ہائے اماں تم خوش قسمت ہو۔ آنکھیں کھولو۔ ایک بار اپنی پوتی کو دیکھ لو۔ ہائے —— ہائے —— "نیاز کی ماں کلیجہ پھاڑ پھاڑ

کر رو رہی تھی۔ جیسے اس کا سارا جسم بُری طرح لرز رہا تھا۔ ماں کی لاش نہ اٹھوا سکنے کی بے بسی ماں کے مرنے کا غم ادھر روپے مل جانے کی خوشی تینوں نے مل کر اس کے چہرے پر عجیب سی کیفیت پیدا کر دی تھی، ایسا لگ رہا تھا۔ کہ جیسے رنج و خوشی آپس میں ٹکرا کر اپنی ضدیں بھول گئے ہوں ——————— محلے کی عورتیں ڈبڈبائی ہوئی متشکر نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ اور خاتون کی بڑی عجیب سی حالت ہو رہی تھی۔ جیسے وہ متشکر نگاہیں مع پلنگ کے آسمان کی طرف اٹھائے لئے جا رہی ہوں۔ زمین اور زمین پر پڑی ہوئی ہر چیز اس سے دور ہوتی جا رہی تھی۔ پھر اس کی کیفیت اس وقت ختم ہوئی جب چھوٹے سے چوکور صحن میں اینٹوں کا چولہا بنا کر آگ جلا دی گئی تھی۔ پانی سے بھرا ہوا بڑا سا بے قلعی پتیلہ چولہے پر رکھ دیا گیا تھا۔ آگ کے شعلوں کے سائے دیواروں پر کپکپا رہے تھے۔ اور میّت کو نہلانے کے لئے بھیانک اور جذبات سے عاری صورت کی موٹی سی غسالنی ایک طرف بیٹھی پان چبا رہی تھی۔ اور نیاز محمد کی ماں دیوار کا سہارا لئے تنہا زمین پر بیٹھی لمبی لمبی آہیں بھر رہی تھی۔ دادی امّاں کے سرہانے سلگتے ہوئے لوبان کا دھواں دالان میں بے چین ہو رہا تھا۔ خاتون نے سہمی اور نفرت زدہ نظروں سے غسالنی کو دیکھا۔ عام انسانوں سے کس قدر مختلف تھا اس کا چہرہ، اس کا چہرہ جیسے پکار پکار کر کہہ رہا تھا۔ جب دوسروں کے کلیجوں میں آگ لگتی ہے۔ تو میرے پیٹ کی آگ ٹھنڈی ہوتی ہے۔ مجھے کسی کے مرنے کا غم نہیں ہوتا۔ موت میرا کاروبار ہے۔ زندگی سے مجھے نفرت ہے خاتون نے مارے نفرت کے اپنا چہرہ بانہوں میں چھپا کر اچھی طرح دیوار کا

سہارا لے لیا۔ اب اسے بے چینی سے انتظار تھا کہ کب دادی انّا اٹھیں اور وہ اپنے گھر جائے۔ کئی گھنٹے کی مسلسل بے آرامی۔ روتا بسورتا ماحول۔ گرمی اور گھٹن۔ ساری جان میں چنگیاں لگ رہی تھی۔ مگر ابھی تو میت کو نہلانے کے لئے پانی گرم ہو رہا تھا۔ خاتون اپنی جگہ پر بیٹھے بیٹھے اونگھ گئی۔ اور جب بے چین سی نیند اس پر پوری طرح سے چھا گئی تھی۔ تو بہت سی چیخیں اس کے کانوں کے پار ہو گئیں۔ وہ سوتے سے اچھل کر کھڑی ہو گئی۔ دادی انّا کو غسل دے کر کفنایا جا چکا تھا۔ نیاز کی ماں زمین پر پچھاڑیں کھا رہی تھی۔ محلے کی عورتیں اسے سنبھال رہی تھیں۔ ڈیوڑھی میں کئی بھاری بھاری آوازیں چیخ رہی تھیں۔ "پردہ کر لو" خاتون دادی انا کے پاس کھڑی ہو کر ان کے کفن سے جھانکتے ہوئے پیلے چہرے کو حسرت سے دیکھنے لگی۔ موت کا زبردست پہرہ لگا ہوا تھا۔ شکست خوردہ زندگی کا کہیں دور دور پتہ نہ تھا۔ خاتون کی آنکھوں سے بے شمار آنسو بہہ نکلے۔

"پردہ کر لو، دیر ہو رہی ہو، پردہ کر لو، نیاز کا باپ اور کئی آدمی چیختے ہوئے اندر آنے لگے تو محلے کی عورتیں لپے لپنے دوپٹوں میں چھپ چھپ کر بیٹھنے لگیں۔ نیاز کے باپ نے آگے بڑھ کر دادی انّا کا چہرہ کفن میں چھپا کر بوری کے منہ کی طرح باندھ دیا۔ لاش کو آہستہ سے کئی آدمیوں نے سہارا دے کر اٹھایا، اور جب کلمہ پڑھتے ہوئے باہر جانے لگے تو نیاز کی ماں دیوانہ وار ان کے پیچھے پیچھے بھاگنے لگی۔

آہ! مت لے جاؤ، مت لے جاؤ میری ماں کو، چھوڑ دو خدارا!" نیاز کی ماں بے تحاشا چیخ رہی تھی۔ خاتون نے اسے باہر نکلنے سے بڑی مشکل سے روکا

میت نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ تو نیاز کی ماں زمین پر لیٹ کر سینہ کوٹتے کوٹتے جیسے بے ہوش سی ہونے لگی۔ محلے کی عورتوں نے پانی کے چھینٹے مارے۔ دو گھونٹ پانی حلق میں ڈالا۔ اور نیاز کی ماں نے آنکھیں کھول دیں۔ "آہ۔ آہ ہائے رے ـــــــ" وہ دیوار کا سہارا لے کر بیٹھتے ہوئے جیسے کراہنے لگی۔ اور پھر ایک دم چپ ہو کر اس طرح آنکھیں بند کر لیں۔ جیسے سو گئی ہو تھک کر ـــــــ محلے کی عورتیں نمازی پرہیز گار اور محلے کے ہر فرد سے محبت کرنے والی دادی اناّ کی دائمی جدائی پہ اس طرح چُپ اور سوگوار بیٹھی تھیں۔ جیسے ان سے ان کا سب کچھ چھین لیا گیا ہو۔ لیکن تھکی ماندی خاتون اب صرف گھر جانے کے لئے سوچ رہی تھی۔ تھکا ہوا دل و دماغ دادی اناّ کے غم کو ان کے ساتھ دفن کر چکا تھا۔ آرام رہے سہے انگڑائیاں لے رہا تھا۔ لیکن اس سے کچھ کہتے نہ بن پڑتی۔ صرف اسی خیال کی وجہ سے کہ سب کیا کہیں گے۔؟ تو ابھی تو دادی اناّ کو اٹھے چند منٹ گزرے ہیں۔ ابھی تو ان کی نعش قبرستان بھی نہ پہنچی ہو گی۔ اور صاحبزادی کو اپنے آرام کی سوجھنے لگی۔ یہ وہی صاحبزادی ہیں جن کا کلمہ خدا کے بجائے پڑھا۔ ہے رے دنیا۔ اور خاتون الکسائی سی چپ چاپ بیٹھی کسمساتی رہی ـــــــ وہ وقت گزارنے کے لئے چراغ کی مدھم روشنی میں دالان کی ایک ایک چیز کو گھورنے لگی۔ چراغ کی ننھی سی کپکپاتی ہوئی سرخ زبان، تیل میں گرے ہوئے ننھے ننھے پتنگے۔ زمین پر لڑھکتا ہوا پانی کا گلاس، کئی لبسورتے ہوئے چہرے اور دادی اناّ کا وہ پلنگ جس پر ذرا دیر پہلے وہ جیسے چادر اوڑھے سو رہی تھیں۔ اب بغیر بستر

کے وہ کھرا پلنگ کس قدر سونا اور بھیانک لگ رہا تھا۔ جیسے اس نے بچاری دادی کو نگل لیا ہو ——— نیاز کی ماں ٹک ٹک سو نے پلنگ کو دیکھ رہی تھی۔

بس آپ کے لئے ٹانگہ لے آیا ہوں، چلئے رات بہت ہو رہی ہے۔" دہلیز میں کھڑے ہوئے نیاز محمد کی آواز آئی ———

"اچھا"! خاتون نے اپنے پاس پڑا ہوا برقع اٹھا کر اوڑھ لیا۔ نیاز کی ماں اٹھ کر خاتون سے لپٹ گئی۔ اور پھوٹ پھوٹ کر بڑی بے بسی سے رونے لگی۔" صبر سے کام لو نیاز کی اماں، رونے سے کیا فائدہ"؟ خاتون نے اسے الگ کرتے ہوئے کہا اور پھر ان عورتوں کی طرف ایک اچٹتی سی نظر ڈال کر تیزی سے نیاز محمد کے پیچھے ہولی۔

ایک بار پھر تانگہ بڑی بے بسی سے گڑھے دار سڑک پر دھچر دھچر کرتا ہوا جا رہا تھا۔ اور ہر طرف سے گھرا ہوا ابر جیسے ہر لمحے برس کر خاتون کو پانی سے شرابور کر دینے کی دھمکیاں دے رہا تھا ——— بجلی کی پتلی سی تلوار جیسی سیاہ ابر کو پھاڑتی ہوئی بار بار لہراتی اور غائب ہو جاتی ——— دوکانیں بند ہو چکی تھیں۔ سڑک پر ویرانی نے ڈیرہ ڈال رکھا تھا۔ کہیں کہیں کوئی راہ گیر کھانستا کھنکھارتا یا گنگناتا ہوا نظر آجاتا یا پھر دم دبائے ہوئے کتے ———

نیاز محمد تانگے کی اگلی سیٹ پر بیٹھا سڑک کی سونی سونی روشنی میں نہ جانے کیا دیکھ رہا تھا۔ کبھی کبھی ایک طویل آہ اس کے لبوں پر دم توڑ دیتی

اور خاتون بھیگنے اور بیمار پڑنے کے خیال سے بے زار ہو رہی تھی۔ لیکن گھر تو اس کا ابھی بہت دُور تھا۔

" نیاز۔ دادی اناں کی حالت کب سے خراب ہوئی تھی ؟ خاتون وقت گزارنے کے لئے باتیں کرنے لگی۔ بجلی زور سے کوندی اور بادل گرج اٹھا

" آج صبح سے "۔ نیاز نے بڑے کرب سے جواب دیا۔

" اور انتقال کس وقت ہوا؟"

" کوئی ۴ بجے شام کو" نیاز نے ایک لمبی سانس لے کر کہا۔

" ہا ـــــ ہ ـــــ بچاری دادی اناں ـــــ اور خاتون کو ایک دم وہی سر بلند کر دینے والا خیال آگیا ـــــ دادی اناں خدا کے بجائے اس کے نام کا کلمہ پڑھتے ہوئے مریں " کیا کیا کہتی تھیں۔ مرنے سے پہلے "؟ نیاز سے پھر وہی بات سننے کی تمنا خاتون کو اکسانے لگی۔

" کچھ بھی تو نہ کہا تھا آہ ! ہا ـــــ ہ ـــــ بس کلمہ پڑھتے پڑھتے خدا کو پیاری ہو گئیں۔"

کس کا کلمہ، اوہ ! خاتون اپنے سوال پر ایک دم جھینپ گئی۔ بھلا یہ کوئی پوچھنے کی بات تھی۔ کہ دادی اناں اس کا کلمہ پڑھتے ہوئے مریں ؟ کس قدر نامعلوم سوال کیا ہے اس نے۔

" کلمہ کس کا ہوتا ہے ـــــ ! خدا رسول کا کلمہ تھا، آپ بھی بعض وقت بچوں جیسی بات کرتی ہیں بجیا ـــــ نیاز محمد زبردستی ایک تلخ

ہنسی ہنس پڑا اور خاتون کا جیسے کسی نے کلیجہ نوچ لیا ہوا۔
تم بھی ان کمبخت فقیرنیوں کی محبت پر یقین کرتی ہو۔ یہ تو محبت کا ڈھونگ رچا کر لوٹتی ہیں کمینیاں ——— خاتون کو اپنی ماں کی بات یاد آگئی۔ جب انہوں نے خاتون کے روپے، بھیجنے پر ایک بار بہت بگڑ کر کہا تھا

"تیز چلاؤ تانگہ" خاتون تقریباً چیخ پڑی

"رات کے گھور اندھیرے میں رم جھم رم جھم پانی برسے جا رہا تھا "ہوں ہوں ـــــ ہاں ـــــ ہاں" پھولے پھولے گالوں والی چلبلی عورت اپنے بستر پہ لیٹے لیٹے گنگنا اٹھی۔

"ہاں! ہاں کوئی اچھا سا گیت گاؤ" معصوم صورت لڑکی جو اس کے قریب ہی زمین پر بچھے ہوئے بستر پہ لیٹی آنکھیں کھول موند رہی تھی۔ اسے ایسے شوق سے دیکھنے لگی جیسے اب وہ اونچے سُروں میں کوئی اچھا سا گیت ضرور گائے گی۔ ایسا گیت کہ یہ ناگن جیسی بپھری ہوئی رات مست ہو کر لہرا اٹھے گی۔ اور اس کا بھی اچھا وقت گزر جائے گا ـــــ ویسے تو کل تک، وہ یہاں اسی طرح بے چین سی پڑی تھی۔ جیسے کسی مسافر خانے میں رات

بسر کر رہی ہو۔ صبح کوئی اسے لینے آئے گا۔ وہ پھر سفر کرے گی۔ اس لئے کیا فائدہ کہ ایک رات کے لئے وہ کسی سے جان پہچان پیدا کرے۔

اسی طرح کتنے دن گزر گئے تھے۔ مگر کل سے اس کی یہ کیفیت ختم ہو گئی تھی۔ رات طویل ہو گئی تھی —— اتنی طویل کہ وہ صبح جس میں وہ سفر کرنے والی تھی۔ ہما کا سایہ بن کر رہ گئی تھی۔ مسافر خانہ گھر بن گیا تھا —— وہ سب سے بولتی بات کرتی اور تھوڑی بہت دلچسپی بھی لیتی۔ لیکن وہ ہر لمحے کھو جانے والی دبلی پتلی، سانولی لڑکی، جس کے چہرے پر ایک دائمی اداس شام سوئی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ اس وقت بھی اسی طرح گم سُم بیٹھی کھڑکی سے باہر رچے بسے اندھیرے میں نہ جانے کیا تلاش کرتی ہوئی معلوم ہو رہی تھی۔ اس کی بڑی بڑی آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی تھیں۔ اور وہ ہر چیز کی طرح کوٹھری میں گونجتی ہوئی مدھ بھری گنگناہٹ سے بھی غافل لگ رہی تھی۔ لیکن جب ایک بھرے بھرے جسم کی عورت، کمبل میں لپٹا ہوا بستر اٹھائے کوٹھری میں داخل ہوئی۔ تو گردن موڑ کر اسے دیکھنے لگی —— گنگناتی ہوئی چلبلی عورت چپ چاپ ہو گئی اور معصوم کمسن لڑکی اس طرح اپنے بستر پر نصف اٹھ پڑی جیسے وہ نئی عورت کا خیر مقدم کر رہی ہو۔

آنے والی عورت نے ایک اچٹتی ہوئی نظر سے ان تینوں عورتوں کو دیکھا۔ پھر ان کے قریب کی خالی جگہ پر اپنا بستر بچھا کر لیٹ گئی۔ کمبل سینے تک کھینچ لیا۔ اور اپنے ساتھ لائی ہوئی موٹی سی کتاب کھول کر اس طرح پڑھنے لگی جیسے ان تینوں عورتوں کا وجود اس کے لئے بس اتنی ہی حقیقت رکھتا ہے۔ جیسے کوٹھری کے در و دیوار

اور بجلی کا روشن قمقمہ ـــــــــــ سانولی لڑکی پھر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی ۔ معصوم صورت لڑکی بھی اس کی کتاب دیکھ کر لیٹ گئی تھی ۔ اور اپنی مخصوص ادا سے آنکھیں جھپکانے لگی تھی ۔ ہاں ، چلبلی عورت ضرور اسے مسلسل دیکھے جارہی تھی ۔ نئی عورت سے باتیں کرنے کی خواہش اس کی آنکھوں میں اس بری طرح اودھم مچائے ہوئے تھی کہ لگتا ، اگر تھوڑی سی دیر اور نئی عورت کتاب پڑھتی رہی تو وہ اٹھ کر اسے جھنجھوڑ ڈالے گی ـــــــــــ بھلا یہ بھی کوئی بات ہے کہ تم آئیں اور کتاب کھول لی ـــــــــــ تم کون ہو؟ کہاں سے لائی گئی ہو؟ کیا نام ہے تمہارا؟ تم کس کے پاس تھیں؟ اس نے تمہیں کس طرح رکھا تھا؟ اور یہ تمہارے ہاتھ منہ پر پکے پکے دانے کیسے پھلے پڑے ہیں؟ یہ تو کوئی بڑی بری سی بیماری لگ رہی ہے ۔ آخر یہ سب کیا ہے؟ ہمیں بتاؤ ـــــــــــ اور پھر ہم سے سنو ہماری کہانی ، چھپانا کس بات کا ۔ آخر تو ہم سب ایک حمام میں ننگے ہیں ـــــــــــ پھر لیں سب سے الگ تھلگ ہو کر کتاب پڑھنا کیا معنی ـــــــــــ ؟ اور آنے والی عورت اس کی کچھ کہنے کچھ سننے کی تمنا سے بے خبر کتاب کے ایک ہی صفحے کو دیکھتے دیکھتے اب بجلی کے قمقمے کی روشن آنکھ میں آنکھ ڈالے جانے کیا سوچ رہی تھی ۔ کم طاقت کے قمقمے کی زرد بیمار روشنی میں اس کے پکے پکے دانے چمک رہے تھے ۔ اور اس کا سوچ بچار پیشانی پر سمٹ کر ایک موٹی لکیر بن گیا تھا ۔

اب تو سب کچھ خواب ہو گیا ـــــــــــ آہ ـــــــــــ " سانولی لڑکی اندھیرے میں گھورتے گھورتے زیر لب بڑبڑائی ۔ کھڑکی سے داخل ہوتے ہوئے ہوا کے

تیز جھونکوں نے اس کے شانوں پر پڑے ہوئے کمبل کو نیچے گرا دیا تھا اور اس کا بڑا سا پیٹ جسے وہ ہر ہر طرح چھپائے رکھتی اس وقت اس کی گود میں گٹھڑی کی طرح پڑا ہوا صاف نظر آ رہا تھا۔ لیکن وہ اس حد تک گم سم تھی کہ اسے پیٹ چھپانے کا بھی ہوش نہ تھا۔

"ہی ——— ہی ہی ———" چلبلی عورت اسے بڑبڑاتے سن کر اسی طرح ہنسی جیسے بیچاری سانولی لڑکی پاگل ہو۔ معصوم لڑکی نے گردن موڑ کر اسے معصومیت سے دیکھا اور پھر آنکھیں جھپکانے لگی ——— نئی عورت نے اس پر ایک بہت گہری نظر ڈالی اور پھر بجلی کا قمقمہ گھورنے لگی۔ اب کتاب اس کے سینے پر کھلی پڑی تھی۔

"جانے تم ہر وقت کیا سوچا کرتی ہو۔ آپ ہی آپ باتیں کرتی ہو ———" چلبلی عورت سانولی لڑکی کے بستر کی طرف کھسک کر کہنے لگی ——— "بھلا یوں کب تمہارا دماغ ٹھیک رہے گا۔ تندرستی الگ دن کوڑی کی ہوئی جاتی ہے۔ سوچ سوچ کے۔ ابھی چار یا پانچ مہینے کا بچہ ہوگا۔ مگر اس سوکھے مرجھلے جسم پر پیٹ لگتا ہے مٹکا جیسا پورے دنوں کا اور یہیں تو ———" سانولی لڑکی نے گھبرا کر اسے دیکھا۔

"چپ بھی رہو، جانے کیا انٹ شنٹ باتیں کرنے لگتی ہو تم بھی، ابھی اچھی بھلی گا رہی تھی ——— اس نے کمبل اوڑھ کر کرب سے پہلو بدلا اب گاؤ نا، کتنی اچھی ہے، تمہاری آواز، کیا درد ہے، بس جی چاہتا ہے سنتے چلے جاؤ" ——— اس نے اس طرح لو کھلائے ہوئے لہجے میں اس

کی آواز کی تعریف کی۔ جیسے وہ اسے دوسری طرف لگاکر اپنے متعلق کچھ نہ سننا چاہتی ہو ـــــــ اس قسم کی باتوں پر وہ ہمیشہ پریشان ہوجایا کرتی۔ کرب اس کے چہرے پر بُری طرح تلملا اٹھتا۔ شاید وہ اپنے پیٹ میں چھپی ہوئی تلخ حقیقت کا تصور بھی نہ کرنا چاہتی تھی۔ پر ناخنوں سے گوشت کب جدا ہوتا ہے۔ چلبلی عورت بھی بڑی باتونی تھی۔ شاید خاموشی میں اس کا دم گھٹتا تھا۔ وہ سونے سے چند منٹ پہلے تک باتیں کرتی رہتی۔ اور صبح تکیے سے سر اٹھاتے ہی پٹر پٹر باتیں کرنے لگتی۔ اور پھر جھوٹ اور حقیقت سبھی میں غوطے لگا آتی۔

"اب کون گائے جی ۔" چلبلی عورت اپنی اچھی آواز کا فخر لئے ہوئے مسکرائی گاؤ بھی ـــــــ جیل کی کوٹھری میں کوئی آزادی کا گیت گا دو۔

ہم برسوں کی غلامی کے بعد آزاد ہوکر اب تو اطمینان سے یہاں بیٹھے ہیں آکر۔"

نئی عورت کروٹ لے کر طنز میں بھی ہنسی ہنسنے لگی۔ ـــــــ سانولی لڑکی نے گردن موڑ کر اسے دیکھا۔ بڑی جانی پہچانی نظروں سے اور پھر جیسے اس کی نظریں چیخنے لگیں ـــــــ تم تو بڑی سمجھدار اور بہت اچھی معلوم ہوتی ہو۔ مجھے تمہاری ہی ضرورت تھی۔ میں کتنے دنوں سے ان دونوں عورتوں کے ساتھ گھٹ گھٹ کر زندگی گزار رہی ہوں ـ مجھے ایک دوسرے سہارے کی ضرورت تھی۔ تم آگئیں تو شاید میں اپنے سینے سے ساری گھٹن اگل سکوں۔"

تم کہاں سے آئی ہو؟" چلبلی عورت نے نئی عورت کی بات کا جواب دینے کے بجائے خود سوال کر دیا۔

جہاں سے تم سب ۔" نئی عورت کے لہجے میں مذاق تھا۔ چلبلی عورت ہنس

دی۔

"ارے واہ ــــــ ہم تو یہ پوچھ رہے ہیں کہ تم کہاں تھیں، کیا قصہ ہوا تھا۔ تمہارے سب عزیز کہاں ہیں؟"

"کون جانے کہاں ہوں گے ــــــ برسوں کی غلامی کو جھٹک دینے کی خوشی میں شاید ان کے خون سے زمین پر گل بوٹے بنائے گئے ہوں گے۔"

اس نے ایک لمبی آہ بھری ــــــ برسوں کا قیدی جیل سے باہر نکل کر راہ بھٹک جاتا ہے۔" وہ زیر لب بڑبڑائی۔ چلبلی عورت کوٹھری میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ جیسے اس کے ان پڑھ دماغ میں ایک بات بھی نہ آئی ہو۔ معصوم لڑکی بھی اسے اسی طرح دیکھ رہی تھی۔ جیسے نئی عورت کسی دوسری دنیا کی باتیں کر رہی ہو سانولی لڑکی اپنا دبلا پتلا جسم گھسیٹتی اس کے قریب کھسک آئی تھی اور نظروں ہی نظروں میں اسے باتیں کرنے کی دعوت دے رہی تھی۔ اس کے چہرے سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ سب دنوں سے زیادہ اداس ہے۔ آج اس کے چہرے پر کرب کہیں زیادہ جاگ رہا ہے۔ آج وہ گھٹ گھٹ کر سوچنے کے بجائے کچھ کہنا چاہتی ہے اپنے دل پر رکھا ہوا بھاری بوجھ کچھ ہلکا کرنا چاہتی ہے ــــــ آج اسے ایک دکھ بھری بپتا کا سننے والا مل گیا ہے۔ وہ بہت کچھ کہے گی۔

نئی عورت کے چہرے پر گہرا سوچ بچار جاگ رہا تھا۔ اس نے سانولی لڑکی کو شفقت سے دیکھا اور خود بھی اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس کے لبوں پر میٹھی میٹھی مسکراہٹ پھیلنے لگی۔ جس سے اس کے گالوں کی سوجن سے تنے ہوئے چہرے پر بہت سی شکنیں پڑ گئیں۔

بہت رنجیدہ نظر آتی ہو۔ یہ پیارا پیارا کرشن کی مورتی جیسا چہرہ تو مسکرانے کے لئے ہے۔" نئی عورت نے بہت پیار سے کہا۔

"میں مسکراؤں گی ——؟ شاید کبھی بھی نہ مسکرا سکوں گی۔" سانولی لڑکی نے ایک لمبی آہ بھری اور آگے آتے ہوئے گھنگھریالے بالوں کو پیچھے جھٹک کر کچھ سوچنے لگی۔ شاید وہ سوچ رہی ہوگی کہ کرشن بھگوان کے پجاری کرشن بھگوان کی مسکراتی ہوئی بے جان مورتی کے سامنے جھک کر اس کی مسکراہٹ سے شانتی حاصل کر سکتے ہیں مگر کرشن بھگوان جیسی سانولی صورت کے انسانوں کی مسکراہٹ چھین لیتے ہیں۔ اس کی مسکراہٹ بھی اس سے چھین لی گئی تھی —————— اس سے اس کا محبوب چھین لیا گیا تھا۔ وہ محبوب جسے دیکھتے وقت اس کی آنکھیں پلکیں جھپکانا بھول جاتی تھیں ——— جسے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں شراب لنڈھنے لگتی تھی۔ جس سے مل کر وہ بلند شاعر کے تخیلات کی طرح نازک اور لطیف بن جاتی تھی۔ جسے اپنانے کے لئے اس نے رات دن کا چین حرام کر دیا تھا۔ جس کے لئے اس نے اپنے ضدی اور ظالم ماں باپ کے قدموں پہ سر رکھ کر کتنی بار آنسو بہائے تھے۔ ان سے اپنی زندگی کی بھیک مانگی تھی۔ جس کے لئے اس نے کتنی ہی راتیں آنکھوں میں کاٹ کر سب کے سونے کا انتظار کیا تھا۔ اور پھر جب سو جاتے تھے تو وہ رات کی تاریکی میں خود کو چھپاتی اپنے محبوب سے ملنے جاتی تھی۔ پُرپیچ گلیوں کو طے کرتی، راہ کے روڑوں سے ٹھوکریں کھاتی ——— اسے اس حالت میں دیکھنے والوں نے دیکھا بھی تھا بدنام بھی کیا تھا۔ مگر وہ اپنی جگہ پہ اٹل رہی۔ وہ امیدوں کا باغ لگا کر پھولوں کا انتظار کرتی رہی۔ لیکن جب اس کے لگائے ہوئے باغ میں کلیاں پھوٹ

کر پھول بننے والی تھیں۔ تو کلکتے سے انسانوں نے انسان کے خون کی ندی بہادی۔ یہ ندی بڑھتے بڑھتے سمندر بن گئی تھی۔ ایسا سمندر جس میں نہ سچی سیپیاں تھیں نہ گھونگے الو کھا سرخ سمندر جس میں انسانی اجسام کی قاشیں تیر رہی تھیں۔ جو سمندر بپھرا ہوا تھا۔ اور جس کے ریلے نے بڑھ کر اس کا باغ بھی خون میں ڈبو دیا۔ شہر کے گلی کوچے ڈوب گئے۔ انسان ڈوب گئے۔ جو بچ رہے وہ خوف و دہشت کے تھپیڑوں سے ٹکراتے شہر سے باہر جنگلوں میں بھاگ گئے ـــــــــ اور پھر ہزاروں آدمیوں کا قافلہ آہستہ آہستہ رینگ رہا تھا۔ پتوں کی کھڑکھڑاہٹ سے بھی چونک رہا تھا۔ شاخوں کے ہلنے سے بھی کھٹک رہا تھا۔ اسی قافلے میں اس کا محبوب بھی تھا۔ اور وہ بھی تھی خوف و دہشت سے لدی پھندی اپنے محبوب کے بازوؤں کا سہارا لئے ہوئے۔ اور اس کے وہ عزیز بھی تھے جو انسانوں کی بھیجی ہوئی موت سے بچ رہے تھے۔ لیکن ابھی رینگتا ہوا قافلہ شہر کی حدود سے بھی باہر نہ ہو پایا تھا کہ ایک مسلح جتھے نے حملہ کر کے جنگل میں منگل منانا شروع کر دیا۔ قافلہ ان کے شہر کے رونق سلئے جارہا تھا۔ ان کے جذبات کی تسکین لوٹے لئے جارہا تھا۔ ان کا مال لئے جارہا تھا۔ اس لئے انہوں نے اسے لوٹنا شروع کر دیا۔ تڑپتا پھڑکتا مال ـــــــــ وہ بھی لوٹ لی گئی۔ اس کا محبوب اسے چھڑانے کی سزا میں اس کے سامنے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا گیا۔ وہ فرطِ غم سے بے ہوش ہوگئی۔ اور جب اسے ہوش آیا۔ تو نہ قافلہ تھا اور نہ اس کی گرد۔ وہ پھر وہیں تھی۔ جہاں اس کے رہنے بسنے کا حق چھین لیا گیا تھا۔ جہاں لامذہب انسانیت ہندو ہوگئی تھی۔ مسلمان ہوگئی تھی۔ جہاں اس کے لگائے ہوئے امیدوں کے باغ کو اجاڑ دیا گیا تھا اور جہاں اس کی مسکراہٹ چھین لی گئی تھی۔

سانولی لڑکی نے سوچتے سوچتے دکھ بھری آنکھیں اوپر اٹھائیں۔ نئی عورت اب تک اسے محبت و شفقت سے دیکھ رہی تھی ——
"میرا محبوب میری آنکھوں کے سامنے خون میں نہلا دیا گیا۔ آخر اس نے کسی کا کیا بگاڑا تھا۔ —— آخر کیا —— ؟" وہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی

مگر میری جان —— وہ سب کا محبوب تو نہ تھا وہ تو صرف مسلمان تھا۔ نئی عورت ایک کڑوی مسکراہٹ لبوں پہ بھینچنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔ مگر اس کی وہ کڑوی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں سے جھپٹ جھپٹ کر جیسے کہہ رہی تھی —— "

اور جانتی ہو میری جان! جہاں کے لئے تمہارا قافلہ بھاگ رہا تھا۔ وہاں کتنے محبوب مار دئے گئے۔ کیونکہ وہ صرف ہندو تھے —— اور کتنے ہی چمکتے دمکتے ماتھوں پہ سیندور سے بنی بندیاں خون ہو کر ٹپک گئیں۔ اور جہاں سے تم آئی ہو وہاں کتنے محبوب مار دئے گئے۔ جو صرف مسلمان تھے۔ مارنے والوں کے لئے، اور ان کی محبوباؤں کی مانگ میں بھری ہوئی افشاں ہواؤں میں خاک کے ذرّوں کی طرح اڑ گئی۔ ان کے رنگین دوپٹے تار تار ہو گئے۔ ان کے سینے برہنہ ہو گئے تاکہ وہ ہمیشہ ماتم کرتی رہیں۔ اور تم صرف ایک محبوب کو رو رہی ہو۔ جانتی ہو پنجاب کی دھرتی کا کلیجہ پھٹ گیا ہے۔ اب یہاں کبھی کوئی محبوب نہ پیدا ہو گا۔

چپ ہو رہو، میری بہن! صبر سے کام لینا چاہیئے۔" چلبلی عورت

اسے روتا دیکھ کر اس کے قریب کھسک آئی تھی۔ اور بھرائی ہوئی آواز میں کہہ رہی تھی ——————— "اس جیل میں جانے کتنی لٹی ہوئی عورتیں بھری پڑی ہیں۔ ایک سے بڑھ کر دوسری کا دُکھ" اس نے زور سے سانس لی۔ معصوم لڑکی اسی طرح چپ چاپ اپنے بستر پر لیٹی تھی۔ اس کی آنکھیں بھی غم میں ڈوبی ڈوبی لگ رہی تھیں۔

اب میرا ہی دکھ دیکھو نا" چلبلی عورت پھر کہنے لگی:" اماں باوا میرے لئے پہلے ہی کیا کم ظالم تھے۔ ایک ذرا سر سے دوپٹہ اترا اور ہزار سنائیں۔ ذرا ہنسی اور لٹھ کا گیا۔ دروازے سے جھانکا اور اماں نے جوتی اٹھائی۔ ابّا نے سر توڑنے کی دھمکی دی۔

سارے عزیز دار لڑکوں سے پردہ۔ جیسے میں بدمعاش تھی۔ بس ایک ذرا اسنہوڑ تھی۔ ایک جگہ نچلا نہ بیٹھا جاتا تھا۔ تو اس پر اتنے ظلم توڑے جاتے۔ اور اب تو میری حالت ظاہر ہے۔ بھلا کاہے کو کوئی زندہ رہنے دے گا۔ اور پھر کون سا مائی کا لال مجھے اپنے نکاح میں لے گا۔ اور جو لے بھی لے تو عمر بھر جوتی پر رکھ کر روٹی دے گا۔ میں تو ایک منٹ بھی نہ برداشت کر سکوں۔" چلبلی عورت کا پھولا پھولا چہرہ سنجیدہ ہو کر اور بھی پھول گیا۔ وہ جانے کیا سوچنے لگی

اور اگر تمہارے ماں باپ تمہیں لینے آئے تو پھر؟"

صاف انکار کر دو گی جانے سے۔ اور آج سچ کیوں نہ کہہ دوں کہ میں تو زبردستی دلیپ لائی گئی ہوں، بس تو آنا ہی نہ چاہتی تھی۔ میں جانتی تھی کہ

کھوٹا سکہ کوئی بھی نہ لے گا۔ اس لئے جہاں ہوں بس ٹھیک ہوں ۔ سکھ سے ہوں یا دُکھ سے ۔" چلبلی عورت کی ناچتی ہوئی گول گول آنکھیں ایک دم رنجیدہ ہو گئیں۔ معصوم لڑکی اسے حیرت سے دیکھنے لگی۔ جیسے چلبلی عورت نے کوئی بڑی بات کہہ دی ہو۔ لیکن وہ کیا جانتی تھی کہ غلاظت میں پڑے ہوئے انسان نکل بھاگنے کے بعد بھی انسان کے بجائے غلیظ ہی کہلائے جاتے ہوں۔ تو پھر کون کوشش کرے نکل بھاگنے کی۔ بُرے کاموں پر کچھ دن جی کڑھتا ہے۔ ضمیر ملامت کرتا ہے۔ اور پھر عادی ہو جاتا ہے اس لئے ناکہ اچھائی کی بھی کوئی داد دینے والا نہیں۔ لیکن وہ تو معصوم تھی جاپانی گڑیا کی طرح خوبصورت اور معصوم ، بس جتنی چابی بھر دی اتنی ہلی چلی اور جہاں چابی ختم ہو گئی ٹھپ ہو گئی۔ جہاں تھی اسی جگہ رہ گئی۔ پھر جس نے چاہا جہاں بھی اٹھا کر رکھ دیا ———— کل تک یہاں وہ اپنے اس شوہر کے انتظار میں بے چین سی پڑی تھی۔ جو اُس کی معصومیت پر جان دیتا تھا۔ اور اس سے کہا تھا کہ تم پانچ گناہ بھی کر ڈالو تو تمہاری معصومیت ختم نہیں ہو سکتی۔ اور جس نے زندگی کی آخری سانس تک ساتھ رہنے کا وعدہ کیا تھا۔ اور جس کی شادی کو صرف ایک ہفتہ ہوا تھا، شادی کے بعد کا ایک ہفتہ جو اس طرح گزر جاتا ہے جیسے دوڑتی ہوئی ریل پر بیٹھے ہوئے انسانوں کی نظروں سے کوئی رنگین نظارہ اوجھل ہو جائے۔ اس پر اسے امید تھی کہ وہ اسے واپس لینے آئے گا۔ اور اسے اسی طرح سینے سے لگائے گا۔ لیکن جب اسے معلوم ہوا کہ ایک گناہ نہ کرنے

پر بھی اس کی معصومیت ختم ہوگئی ہے۔ اس کے شوہر نے اسے واپس لینے سے انکار کر دیا ہے تو وہ دیر تک پھوٹ پھوٹ کر روتی رہی اور پھر اس لڑکی کی طرح چپ ہو بیٹھی جسے اس کے شوہر نے گھر سے نکال دیا ہو اور جب خود اپنے لئے کچھ نہ کر سکنے کی بنا پر اماں بادا کے گھر آکر بیٹھ رہی ہو۔ اس اطمینان کے ساتھ کہ اب وہ جو کچھ بھی کر دیں ______ پھر بھلا وہ دوسروں کے لئے کیا سوچ سکتی تھی۔ وہ تو بس حیرت سے آنکھیں پھاڑے چلبلی عورت کو دیکھے جا رہی تھی۔ نئی عورت کے لبوں پر گہری مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ اور سانولی لڑکی دوپٹہ میں منہ چھپائے رو رہی تھی۔ ہر شخص کا اپنا غم اتنا بھاری ہوتا ہے کہ دوسروں کا غم چراغ کی بھڑکتی ہوئی لو سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔ وہ جیل جو کبھی اپنی کوٹھڑیوں میں مجرم عورتوں کو مضبوطی سے جکڑ لیتا تھا۔ جس کے درو دیوار سے ظلم اور ہیبت برستی تھی۔ وہی جیل اب ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اغواشدہ عورتوں کے حسرت و ارمان سے لدھے پھندے سات سوجنازے اپنی آغوش میں لئے لئے بیٹھ جائے گا۔ انسان کی انسانیت کا ایک ان مٹ مقبرہ بن جائے گا۔ اور پھر جب یہ انسان اپنے آنسوؤں کے چراغ جلانے آئے گا۔ اور انسان کو بُرا کہے گا۔ لیکن اسے تو ان سب باتوں کا احساس ہی نہ تھا۔ وہ تو صرف اپنے دکھوں میں ڈوبی ہوئی تھی۔

تم مجھے حیرت سے کیا دیکھ رہی ہو؟" چلبلی عورت معصوم لڑکی سے مخاطب ہوگئی ______ میں کہتی ہوں کہ تم جو اس امید پر ساری دنیا بھولے بیٹھی تھیں۔ ۔ یہ تمہارا شوہر آیا اور تمہیں لے گیا تو کیا انجام ہوا ؟

پھر میں تو اپنے ماں باپ کو جانتی ہوں کیسے ظالم ہیں۔ کبھی نہ جاؤں گی۔ ان کے ہاں ہرگز نہیں ۔" اس نے اپنا فیصلہ سنا کر اطمینان کی ایک لمبی سانس لی۔ اس کا چہرہ پھر پُرسکون تھا۔ ــــــــــ سانولی لڑکی نے روتے روتے سر اٹھایا اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ اور پپوٹے بھاری ہو کر جھکے پڑ رہے تھے۔ نئی عورت اسے تسلی آمیز نظروں سے دیکھنے لگی۔ ایسی نظریں جو کہہ رہی تھیں ــــــــــ "صبر کر لو۔ میں تمہارا دکھ جانتی ہوں، مگر ایک اندھا دوسرے اندھے کو راستہ کیسے بتائے ۔"

"ایک بار" سانولی لڑکی آہستہ آہستہ کہنے لگی ــــــــــ میں سب سے چھُپ کر جب اپنے محبوب سے ملنے گئی تو وہ نہ جانے کیوں پہلی بار مجھ سے ضد کرنے لگا۔ میں اسے اپنے ہونٹوں پہ پیار کر لینے دوں۔ لیکن میں نے اسے کہہ دیا کہ میں نے عہد کیا ہے کہ جب تک ہم ایک دوسرے کو حاصل نہ کر لیں قریب نہ ہوں گے۔ میرا ضمیر ملامت کرتا ہے۔ اور میری اس بات پر وہ کتنا رنجیدہ ہو گیا تھا۔ اس وقت بھی اس کا چہرہ میرے سامنے ہے ۔" ــــــــــ ایک لمحے کو خاموش ہو کر اس نے ایک لمبی آہ بھری۔ اور پھر کہنے لگی ــــــــــ

"کاش میں نے اپنے ہونٹوں کو چوم لینے دیا ہوتا ــــــــــ وہ اپنے بڑھے ہوئے پیٹ پہ ہاتھ رکھ کر حسرت سے نئی عورت کو دیکھنے لگی۔ پھر جیسے فرطِ غم سے چیخ پڑی ــــــــــ " اور اب تو مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ میرے پیٹ میں بڑھتا ہوا پھوڑا ان درندوں میں سے کس کا ہے ۔" وہ پھر دوپٹے میں منہ چھپا کر سسکنے لگی۔ ــــــــــ باہر بارش اب تیز سی

سے ہو رہی تھی۔ بجلی کی لہر بار بار کھڑکی کی طرف لپک رہی تھی۔ اور کوٹھری کے اندر اداسی جیسے سر پٹک رہی تھی۔

"صبر کرو، صبر، میری بہن ——— دکھوں کو بڑھانے سے کیا فائدہ" ——— چلبلی عورت بھرائی ہوئی آواز میں کہنے لگی ——— تمہارا محبوب مار دیا گیا۔ تو میرا بھی تو گھر لٹ گیا۔ مگر میں صبر کر رہی ہوں ——— میں وہیں چلی جاؤں گی۔ جہاں سے آئی ہوں۔ میں جس کے پاس تھی اس نے مجھ سے چلتے وقت کہا تھا کہ دونوں حکومتیں لٹی ہوئی عورتوں کے خزانے برآمد کر رہی ہیں۔ مگر ان خزانوں میں سب سکّے کھوٹے ہیں۔ وہ ایک بھی نہ چلا سکیں گی۔ تم جب چاہنا میرے پاس آجانا، میں تمہارا انتظار کروں گا اور جب میں زبردستی لائی جا رہی تھی تو اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ ——— مگر تم لوگ یہ نہ سمجھنا کہ مجھے اس کے آنسو واپس لئے جا رہے ہیں۔ نہیں ——— اس کی آواز ایک دم جو تیلی ہو گئی ——— مجھے اُس سے محبت نہیں اور نہ نفرت۔ ایک دو نہیں کتنے ہی مجھے بانٹ کھا رہے تھے۔ اس وقت وہ مجھے سب سے چھڑا کر اپنے پاس لے آیا تھا۔ اس نے نہ مجھے سُکھ دیا اور نہ بہت زیادہ دُکھ، بس زندگی گزار لوں گی اس کے ساتھ" وہ ذرا دیر کو رک گئی اور پھر بجھی سی آواز میں کہنے لگی۔ وہ ادھیڑ عمر کا آدمی ہے اور میں جوان۔ بس زندگی گزر ہی جائے گی۔ یہاں مجھے ایک شوہر نہ مل سکے گا۔ مجھے کیسی تمنا تھی ایک گھر

کی ہائے ۔۔اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے جنہیں پونچھ کر وہ کھڑکی سے باہر اندھیرے میں دیکھنے لگی۔ اس طرح جیسے وہیں کہیں اندھیرے میں اس کا گھر کھو گیا ہو۔ وہ گھر جو اس کی تمنا تھا، جس گھر میں اس نے خود کو چمکتے ہوئے رنگین کپڑوں میں تتری کی طرح تھرکتے ہوئے محسوس کیا تھا، اپنے پیچھے لپکتے ہوئے دو مضبوط ہاتھوں کو دیکھا تھا ــــــ جوان ہوتے ہی بس۔ یہی تو ایک تمنا تھی جس نے اس کے دل میں کروٹ لی تھی۔ اور اس کروٹ سے اس کا انگ انگ بے چین ہو گیا تھا۔ اور ماں باپ کی کڑی نظروں کے باوجود وہ اشاروں کنایوں میں اپنا فطری حق مانگ رہی تھی۔ کیونکہ وہ اپنی اس تمنا کو کسی صورت چھپا نہ سکتی تھی۔ لیکن انسان نے اس کا یہ فطری حق بھی چھین لیا، لپکتے ہوئے مضبوط ہاتھ کاٹ دئے اور اس کے چمکتے ہوئے کپڑوں پہ غلاظت اچھال دی۔

واپس جا کر تو بہت بڑا کرو گی، آخر تو ہمارے لئے ایسا انتظام ہو گیا ہے کہ اطمینان سے گزار سکیں۔ تم بھی عورتوں کی فوجوں میں داخل ہو جانا بس" معصوم لڑکی نے کہا۔

مگر ــــــ چلبلی عورت جانے کیا کہنا چاہتی تھی کہ نئی عورت بول اٹھی "لیکن موسم بہار میں خشک ٹھنٹھوں تک پہ کونپلیں پھوٹ پڑتی ہیں نہ ہا۔ تم بیچاری معصوم بچی" ــــــ اس کی آنکھوں میں بے پناہ درد سمٹ آیا؛ وہ معصوم لڑکی کو ایسی نظروں سے دیکھنے لگی جیسے کہہ رہی ہو ــــــ میری جان! جوانی کہیں ہو، کسی حال میں ہو، مگر انگڑائی ضرور لیتی ہے ما یہ

دوسری بات کہ وہ انگڑائی کسی کو اپنے گرد جکڑ کر نہ لوٹ سکے۔ بلکہ اپنے ہی دائرے میں لوٹ کر رہ جائے۔ لیکن جانتی ہو ایسے عالم میں جی کیسا کڑھتا ہے۔ جیسے کوئی ہولے ہولے کلیجہ مسل رہا ہے۔ اوف —— جب راتوں کو چاندنی چھٹک جائے گی۔ رات کے پرند چہچہا اٹھیں گے اور فضا سرگوشیاں سی کرتی ہوئی محسوس ہوگی اس وقت تم کتنی تنہا اور اداس ہو گی۔"

کاش! میں ایسا ٹھنڈ بن سکوں، جس میں کونپلیں پھوٹ پڑیں، مگر یہ کتنا نا ممکن ہے، مجھے موت چاہیئے اور بس" سانولی لڑکی نے روتے ہوئے کہا۔

موت —— ؟ ہنھ! موت کوئی بھی نہیں چاہتا۔" نئی عورت بجھی سی آواز میں آہستہ آہستہ کہنے لگی —— "موت تو شاید وہ عورتیں بھی نہ چاہتی ہوں گی۔ جنہیں انسان نے ننگا کر کے جلوس نکالا تھا، جنہیں انسان نے ہوسناک نگاہوں سے دیکھ کر خوشی سے پھولا سمایا تھا، اس وقت بھی ان خائف عورتوں کی نگاہیں چیخ رہی تھیں، جو بدسلوکی چاہو کر لو مگر ہمیں زندہ رہنے دو" عورت ایک دم پاگلوں کی طرح ہنسی اور پھر جیسے غصّے سے چیخنے لگی موت میں بھی نہیں چاہتی —— یہ دیکھو یہ کیا ہے ؟" ——

وہ اپنے دانوں کو انگلی سے رگڑنے لگی —— اگر تمہیں معلوم ہو جائے کہ یہ کیا ہے تو تم لوگ ابھی مجھ سے دُور بھاگنے لگو، مگر میں کسی کو بھی نہ بھاگنے دوں گی اور" —— وہ مارے غصّے کے کانپنے لگی اس

کی آنکھوں میں نفرت امنڈ رہی تھی۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ چپ ہو گئی ہے مگر اس کے جسم کا ایک ایک رُواں بھپر بھپر کر غصے سے چیخ رہا ہے ـــــ

میں نے دنیا کی ہر دلچسپی سے منہ موڑ کر اپنی جوانی تعلیم کے لئے وقف کر دی تھی۔ اور اس کے بعد بچوں کو تعلیم دے کر انہیں مکمل انسان بنانے کا پسندیدہ کام اپنے ذمے لیا تھا۔ مگر اب میں یہ کچھ نہ کروں گی ـــــ انسان ـــــ آگ، پانی، ہوا، بجلی اور بہت سی ناممکنات پر قابو پا لیتا ہے اور پھر بھاگتی ہوئی بیکس عورتوں کا ننگا جلوس نکالتا ہے۔ میں انسانوں میں اضافہ نہ کروں گی اب ـــــ ہاں اپنے جسم پر بکھرے ہوئے دانے ہر انسان کو بانٹوں گی۔ اور اسے بتاؤں گی کہ یہ تھی تمہاری ترقی کی آخری منزل ـــــ"

معصوم لڑکی غصے میں بھپری ہوئی عورت کو حیرت اور خوف سے دیکھ رہی تھی۔ چلبلی عورت کی آنکھیں ڈبڈبا ہی تھیں۔ اور سانولی لڑکی اسے حیرت سے تک رہی تھی۔ وہ غصے میں کانپتے کانپتے ایک دم بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اور پھر اپنا منہ چھپا لیا۔ صرف چند لمحوں کے لئے، پھر آنسو پونچھ کر وہ اپنے بستر پر لیٹ گئی۔ اور سرہانے پڑی ہوئی کتاب کھول لی۔

کوٹھری میں اداس سکوت چھا گیا۔ بس بے شمار سسکیاں اور آہیں جیسے چپکے چپکے کوٹھری کے مضبوط در و دیوار سے سر ٹکرا رہی تھیں۔ اور وہ زرد زرد روشنی بکھیرنے والا بجلی کا قمقمہ تو یوں لگ رہا تھا۔ جیسے پکے پھوڑے کی طرح پھوٹ کر بہہ جائے گا ـــــ باہر بارش ختم ہو چکی

تھی۔ ——— بس بجلی رہے رہے کھڑکی کی طرف لپک رہی تھی۔ چیلی عورت اپنے بستر پر کھسک آئی تھی۔ اور سانولی لڑکی بھی اب اپنے بستر پر رینگ کر پھر اسی طرح گم سم بیٹھی کھڑکی سے باہر رات کے رچے بسے اندھیرے میں جانے کیا تلاش کر رہی تھی۔

محاذ سے دُور

اجاڑ قصبہ چاندنی میں جیسے سو رہا تھا۔ میونسپلٹی کی میلی لالٹینیں چاندنی کی وجہ سے بجھی ہوئی بے حس و حرکت کھمبوں پر جمی ہوئی تھیں، دُھول سے اٹی بل کھاتی ہوئی لمبی سڑک جیسے زمین پر چپلی ہوئی تھی ——— اور اس سڑک پر قصبے بھر کی مائی" اپنی چھوٹی سی لاٹھی دُھول میں گڑوتی یوں گم سُم سی چلی جا رہی تھی۔ جیسے خود کو کہیں کھو آئی ہو ——— رات کا ابتدائی حصّہ گزر چکا تھا۔ بھوکے مرجھلے کتّے سڑک پر بھونکتے پھر رہے تھے منہ اٹھا اٹھا کر رو رہے تھے، مائی کا راستہ بھی روک رہے تھے۔ مگر اس نے پورے جوش سے انہیں ایک بھی گالی نہ دی۔ ان کی پیٹھ پر ایک لاٹھی بھی نہ دھمکی۔ بور سے لدے ہوئے آم کے درختوں پر

بھیگتی ہوئی کوئلوں کے کلیجوں میں جیسے ہوکیں اٹھ رہی تھیں ۔ مگر مائی کو آج ان کی آواز ذرا بھی رسیلی نہ لگی۔ اور تو اور قصبے کے سب سے بڑے زمیندار کی اونچی حویلی کی اٹریا پر گاتی ہوئی لڑکیوں کی آوازیں بھی اسے نہ چونکا سکیں۔ "کیسے گزاروں مان رتیاں ہائے رام" کی دلگداز لے رات کے سناٹے میں دُور دُور پھیلتی رہی مگر مائی ان آوازوں کو بند کرنے کے لئے بھی کچھ نہ سوچ رہی تھی۔

ابھی ذرا دیر پہلے وہ بڑے بازار گئی تھی۔ آج اس کا جی چاہا تھا کہ کھوئے کے بنے ہوئے نرم نرم پیڑے کھائے جائیں۔ مگر وہ بازار سے یوں ہی پلٹ آئی تھی ما پیڑے لئے بغیر۔ الٰہی بخش کی دکان پر ایک جمگھٹا سا لگا ہوا تھا۔ تھانیدار کا جوان بیٹا بھی وہیں بیٹھا تھا۔ جس کے بارے میں بڑی عجیب عجیب باتیں مشہور تھیں کہ وہ کبھی اپنے باپ کا صحیح جانشین نہ بن سکے گا۔ اسے تھانیداری وانیداری سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ زیادہ سے زیادہ شہر میں رہتا ہے۔ وہاں کے مزدوروں کا سردار ہے۔ اور پہلی رات کی دلہن کے کپڑوں جیسا جھنڈا لے کر نہ جانے کیا اوٹ پٹانگ نعرے لگاتا پھرتا ہے۔ حکومت اس کی دشمن ہے اور خود اس کا باپ اس کا دشمن ہے۔ کہ سالا بیٹا ایسا نکلا کہ باپ کا عہدہ سنبھالنے کے بجائے اس کا عہدہ بھی چھنوا دے۔ لوگ بھی اس سے ڈرتے، پر جانے کیا بات تھی کہ اسے عزیز بھی رکھتے۔ جب وہ کسی دکان کے سامنے کالے کالے لوہے کی کرسی پر ڈٹ کر تقریر جیسی باتیں شروع کر دیتا تو لوگ خوف کھاتے ہوئے بھی مسرت سی محسوس کرتے اور اس کی باتوں پر پناہ ڈھونڈتے ——

اس وقت بھی اس کی زبان جیسے بجلی کی طرح تڑپ رہی تھی۔ مائی ذرا ایک طرف ہو کر کھڑی ہو گئی کہ لاؤ اس باؤلے کی باتیں بھی سنتی چلے۔ اسے بھی وہ کچھ پیارا لگتا تھا

کئی بار وہ اس کے پاس بھی پیغام سلام لے کر گئی تھی۔ مگر ایک مخصوص مسکراہٹ کے سوا اس نے کبھی کوئی جواب نہ دیا تھا۔ اور اسی لئے مائی کو وہ پیارا لگتا۔ وہ اب کچھ آہستہ آہستہ کہہ رہا تھا ——— تو بھیا یہی وجہ ہے کہ کچھ حکومتیں چاہتی ہیں کہ جنگ ہو۔ ایسی جنگ کہ ساری دنیا کو آگ کی بھٹی میں جھونک دیں اور اگر ایسا ہو گیا تو کیا کچھ نہ ہوگا۔ پُر رونق شہر راکھ کے ڈھیر ہو جائیں گے۔ کتنی مامتائیں ویران ہو جائیں گی۔ جانے کتنی لڑکیاں کبھی نہ بننے والے منگیتروں کی راہ تکتی رہ جائیں گی اور پھر یہ دیکھو ——— اس نے انگلی سے مائی کی طرف اشارہ کیا، ایسی کتنی ہی مائیاں پیدا ہو جائیں گی جو اپنی بہو کے لئے بھی ——— اور وہ ایک دم چپ ہو گیا اور مائی کو ایسا لگا کہ اس کے دل پہ ایک موٹی سی کیل ٹھونک دی گئی ہے۔ اس کے منہ پر تھوک دیا گیا ہے۔ دکان کے اردگرد کھڑے اور بیٹھے ہوئے لوگوں کی نظریں ایک دم اس کی طرف اٹھ گئیں وہ سب مسکرا مسکرا کر اسے دیکھ رہے تھے ——— مائی کو ایسا محسوس ہوا کہ ان کی ایک ایک آنکھ میں سو سو گالیاں اودھم ڈھا رہی ہیں۔ اس کا جی چاہا کہ وہ بھی پلٹ کر ایک ایسی گالی دے کہ تھانیدار جی کا بیٹا بھرے بازار میں ننگا ہو کر رہ جائے۔ مگر وہ ایک ہلکی سی بھی گالی نہ دے سکی۔ جس سے وہ اسے نیم عریاں ہی کر سکتی ——— بس چند لمحوں تک وہ بے حس سی کھڑی رہی اور پھر لمبے لمبے ڈگ بھرتی آگے بڑھ گئی۔ پیچھے سے کئی قہقہے اس کی طرف لپکے اور تھانیدار کے بیٹے کی آواز ——— وہ کہہ رہا تھا، مت ہنسو، مجھے دکھ ہوتا ہے، مت ہنسو۔ کچھ تو ——— مائی نے اس سے زیادہ کچھ نہ سنا وہ تیزی سے سڑک پر آ گئی تھی۔ اور پھر جیسے رینگنے لگی تھی، وہ لپکتے ہوئے قہقہے اس کے دماغ میں طوفان

ڈھائے ہے تھے اور دل میں گڑی ہوئی کیل کتنے زور زور سے چبھ رہی تھی۔ وہ اس وقت کچھ بھی نہ سوچ رہی تھی۔ ننھی سی کشتی طوفان کی زد میں آجائے تو تو اپنے بچاؤ کے کیا سامان کر سکتی ہے۔

جب وہ اپنے محلے میں داخل ہوئی تو نیچی نیچی اٹریوں پر کھڑی ہوئی لڑکیاں کچھ سرگوشی کے انداز میں اسے پکارنے لگیں مائی ــــ مائی ــ مگر اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ چپ چاپ آگے بڑھتی گئی اور اپنے سب سے الگ تھلگ بنے ہوئے چھوٹے سے مکان میں داخل ہو گئی۔ اندر سے دروازہ بند کر کے زنجیر چڑھالی ڈیوڑھی اور دالان طے کرتی ہوئی صحن میں آ گئی۔ لکڑی ایک طرف پھینک دی اور پھر زمین پر جیسے گر سی پڑی۔ وہ آنکھیں جو ایک مدت سے ریگستان ہو رہی تھیں۔ آج جانے کہاں سے ان میں آنسوؤں کے سوتے پھوٹ پڑے۔ وہ دیر تک روتی رہی روتے روتے اٹھ کر ایکدم موٹی موٹی سی گالیاں بکنے لگی۔ جن کا رخ تھانیدار کی بیٹے کی طرف تھا۔ اور پھر جب کوئی گالی بھی دینے کے لئے نہ رہ گئی۔ تو پھر رونے لگی۔ یوں ہی دیر تک روتی رہی اور پھر اپنے بال نوچنے لگی۔ دونوں ہاتھوں سے منہ پیٹنے لگی جتنے کوسنے یاد تھے خود کو دے ڈالے اور پھر جیسے تھک کر اوندھی پڑ گئی۔ زور زور سے کراہنے لگی۔ کچھ ایسی خوفناک آواز سے جیسے اس کی سانس اکھڑ گئی ہو۔ موت کا گھیرا لگ گیا ہو ــــــــــ اور تنہا تنہا اجاڑ گھر جیسے اور بھی اجڑ گیا ہو اس کے گھر کی ایک ایک چیز حیران و پریشان معلوم ہو رہی تھی۔ جیسے پوچھ رہی تھیں آخر کیوں؟ انہوں نے تو روزانہ یہی دیکھا تھا۔ کہ مائی اس وقت خوب ڈھیر سا کھا کر اور بہت سی ڈکاریں لے

کہ ایک ذرا دیر کھڑکھڑانے کے بعد باہر نکل جاتی تھی۔ مگر آج ان بے زبانوں کو کون بتاتا کہ آخر کیوں ــــــــ؟

وہ رات کتنی بھیانک رات تھی۔ مائی کی ویران چیخیں دُور دُور سناٹا بکھیر رہی تھیں۔ اس رات نہ جانے کیوں کتے سب دنوں سے زیادہ رو رہے تھے۔ اور مکان کے پچھواڑے ایک ٹھنٹھ پر رات گزارنے والا الّو ساری رات چیختا رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ سب سے بڑا بھیانک منظر دیکھ رہے ہیں۔ کیسا کہرام تھا باہر چیخیں گھر میں چیخیں ــــــــ"

کوئی مغرب کا وقت ہوگا جب اسے اپنے جوان اکلوتے بیٹے کی موت کا تار ملا تھا ــــــــ تار کی عبارت سننے کے بعد تھوڑی دیر تک وہ دم بخود کھڑی رہی تھی۔ اور پھر سینہ کوٹ کوٹ کر خوب ہی روئی تھی۔ شدّت غم سے زمین پر سر پٹک پٹک دیا تھا۔ منہ پیٹ لیا تھا۔ پاگلوں کی طرح بال نوچے تھے۔ اور پھر محلے کی کتنی ہی عورتیں جمع ہو گئی تھیں۔ سب اسے دم دلاسے دے رہی تھیں۔ مگر اسے کسی طرح صبر نہ آتا تھا۔ اس کا دل، ماتا کا ننھا سا پیالا ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا تھا۔ وہ کسی کی کوئی بات نہ سن رہی تھی۔ تسلیوں کے سارے داؤں پیچ خالی جا رہے تھے۔ لیکن جب آدھی رات گزر گئی تو کوئی تسلی دینے والا بھی نہ رہا۔ اسے بڑے انہماک سے تسلیاں دینے والی عورتیں اپنے اپنے گھروں میں جا چکی تھیں۔ صرف اس کی بہو تھی۔ جس کے رونے کی آواز مدھم پڑتے پڑتے ڈوب گئی تھی۔ اور وہ نڈھال ہو کر زمین پر اوندھی پڑی تھی اس کا ننھا سا بچہ بندریا کے بچے کی طرح اس کے سینے سے لگا ہوا تھا۔ اور کلو حجام کی بے حد بوڑھی ماں جو رات بھر کے لئے ٹھہر گئی تھی۔ ایک کونے

کر ایک ذرا دیر کمر ٹکانے کے بعد باہر نکل جاتی تھی۔ مگر آج ان بے زبانوں کو کون بتاتا کہ آخر کیوں ـــــــــ؟

وہ رات کتنی بھیانک رات تھی۔ مائی کی ویران چیخیں دُور دُور سناٹا بکھیر رہی تھیں۔ اس رات نہ جانے کیوں کتے سب دنوں سے زیادہ رو رہے تھے۔ اور مکان کے پچھواڑے ایک ٹھنٹھ پر رات گزارنے والا الّو ساری رات چیختا رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ سب سے بڑا بھیانک منظر دیکھ رہے ہیں۔ کیسا کہرام تھا باہر چیخیں گھر میں چیخیں ــــــــــ"

کوئی مغرب کا وقت ہو گا جب اسے اپنے جوان اکلوتے بیٹے کی موت کا تار ملا تھا ـــــــ تار کی عبارت سننے کے بعد تھوڑی دیر تک وہ دم بخود کھڑی رہی تھی۔ اور پھر سینہ کوٹ کوٹ کر خوب ہی روئی تھی۔ شدت غم سے زمین پر سر پٹک پٹک دیا تھا۔ منہ پیٹ لیا تھا۔ پاگلوں کی طرح بال نوچے تھے۔ اور پھر محلے کی کتنی ہی عورتیں جمع ہو گئی تھیں۔ سب اسے دم دلاسے دے رہی تھیں۔ مگر اسے کسی طرح صبر نہ آتا تھا۔ اس کا دل، ماتا کا ننھا سا پالنا ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا تھا۔ وہ کسی کی کوئی بات نہ سن رہی تھی۔ تسلیوں کے سارے داؤں پیچ خالی جا رہے تھے۔ لیکن جب آدھی رات گزر گئی تو کوئی تسلی دینے والا بھی نہ رہا اسے بڑے انہماک سے تسلیاں دینے والی عورتیں اپنے اپنے گھروں میں جا چکی تھیں۔ صرف اس کی بہو تھی۔ جس کے رونے کی آواز مدھم پڑتے پڑتے ڈوب گئی تھی۔ اور وہ نڈھال ہو کر زمین پر اوندھی پڑی تھی اس کا ننھا سا بچہ بندریا کے بچے کی طرح اس کے سینے سے لگا ہوا تھا۔ اور کلو حجام کی بے حد بوڑھی ماں جو رات بھر کے لئے ٹھہر گئی تھی۔ ایک کونے

میں بیٹھی اونگھ رہی تھی۔ شاید وہ یہ سمجھ گئی تھی کہ ماں بھی بہو کی طرح تھک چپ ہو رہے گی۔ اور ہوا بھی یہی چیخیں مدھم مدھم ہوتے ہوتے سسکیوں میں تبدیل ہوگئیں اور پھر سسکیاں بھی ایک دبی دبی آہ میں کھو گئیں تو مائی نے بھی دیوار سے کمر ٹکا کر آنکھیں موند لیں ــــ رو چکنے کے بعد کا سناٹا کتنا گہرا ہوتا ہے۔ باہر الّو چیخ رہا تھا۔ کتے رو رہے تھے۔ ہوا کے مدھم مدھم جھونکوں سے چراغ کی لو کپکپا رہی تھی۔ مٹی کے پیالے میں سلگتا ہوا لوبان جیسے بل کھاتے ہوئے ننھے ننھے سنپولیے اڑا رہا تھا اور مائی دیوار سے کمر ٹکا کر آنکھیں موندے لمبی لمبی آہیں بھر رہی تھی اور اس کا حافظہ کتنی بہت سی روتی بلکتی یادوں کے ڈھیر لگاتا چلا جا رہا تھا۔

پہلی جنگ عظیم۔ جب اس کا شوہر اس کی جوان آغوش میں صرف ایک ننھی سی جان سونپ کر لڑائی پر چلا گیا تھا۔ وہ اس لئے گیا تھا کہ غریب کسان کی محنت کا پھل زمیندار کھاتا تھا۔ وہ اسے روک نہ سکی تھی۔ اس کا حسن، اس کی جوانی اور معصوم بچے کی کلکاریاں اس کے پاؤں کی بیڑیاں نہ بن سکی تھیں۔ وہ ننگا بھوکا رہتے رہتے تنگ آچکا تھا۔ وہ جلد ہی واپس آنے کا سہارا دے کر چلا گیا تھا۔ اور پھر اس کے دن کتنے سنسان ہو گئے تھے۔ راتیں کتنی ویران ہو گئی تھیں۔ تارے اسے ٹین کی فضول سی ٹکلیاں معلوم ہوتے تھے اور چاند بد قلعی تھالی محسوس ہوتا۔ وہ رات دن اپنے شوہر کا انتظار کرتی رہتی۔ لیکن وہ نہ آیا۔ اس کی موت کی خبر آگئی اور اس کے انتظار نے بھی دم توڑ دیا۔ کچھ دن تک وہ ہر طرف سے غافل ہو کر روتی بلکتی رہی۔ اور پھر اپنی محبت کے اچھے دنوں کی یادگار کو پروان چڑھانے میں خود کو گم کر دیا۔ ان دنوں یہ بھی ہوا کہ جب لوگوں نے میدان صاف دیکھا تو ایک ذرا ڈورے لگانے کی کوشش کی۔ مگر

اس نے بھی ایسی ایسی میٹھیاں دیں کہ اچھے اچھے ہمت کھو بیٹھے اس کی دنیا اس کا لعل تھا وہ محنت
اور مزدوری کر کے اپنے بچے کو پالنے لگی۔ اور جب سرکار کی طرف سے زندگی کی قیمت ہر چند ماہ
سکوں کی صورت میں چکائی جانیوالی تھی۔ تو لوگوں نے دشمنی سے اس کا بھی خاتمہ کرا دیا تاکہ وہ مصیبتوں
سے تنگ آ کر خود کو بیچ دے اور پھر اس وقت تک ہر ایک کے لئے لبکا رہے جب تک اس کا
چہرہ چکنا رہے اور اس کا جسم بھرا رہے۔ یہ بات اسے بہت دنوں بعد معلوم ہوئی تھی اور وہ رو
پیٹ کر چپ ہو رہی تھی۔ پھر اس کا بیٹا جوان ہو گیا وہ کیسا خوبصورت اور تنومند تھا۔ جیسے اس نے اپنی
جوانی اور حسن بچے میں سمو دیا تھا۔ اس کی کمر وقت سے پہلے جھک گئی تھی۔ مگر اسے ذرا بھی رنج نہ تھا
وہ اپنے بچے کی ہر خوشی دیکھنا چاہتی تھی۔ اس نے جلدی سے اس کی شادی بھی رچا ڈالی۔ ایک ننھی
منی تڑی خوبصورت سی گڑیا بھی گھر لے آئی۔ جس کے پاؤں میں بجتی ہوئی جھانجھ اس کے سینے
میں جانے کتنے گیت جگا دیتی۔ وہ مغرور سی ہونے لگتی۔ مگر پھر یہ خوشیاں دیکھ چکنے کے بعد کیوں
وہ خود کو ٹوٹا تھکا ہوا محسوس کرنے لگی تھی۔ اس سے نہ محنت ہوتی وہ مزدوری کے لائق نہ رہ گئی تھی
وہ بہت تھک گئی تھی۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ اب وہ آرام کرے۔ اسے امید تھی کہ اس کا بیٹا
یہیں کہیں نوکر ہو جائے گا۔ اس نے اسے مڈل تک پڑھایا تھا اور اسی امید پر ایک دن اس نے اپنے
بیٹے سے اپنی خوشی کا اظہار کر دیا۔ اس کا بیٹا جو اپنی ننھی سی دلہن کے نویلے پن میں کھویا ہوا تھا
چونک پڑا مگر قصبے میں کہیں نوکری نہ تھی۔ وہ کوشش کر کر کے تھک گیا۔ اس کے شہر جانے کا راز وہ
ظاہر کیا لیکن وہ اس کی جدائی کے خیال سے ہی کانپ اٹھی۔ وہ اسے سمجھاتا رہا۔

شہروں میں تو ایک خدائی بھری پڑی ہے۔ وہاں نوکریاں پڑی پھرتی ہیں، یہاں اس
اجاڑ قصبہ میں رکھا ہی کیا ہے۔ میں جاؤں گا اور پھر جلدی سب کو اپنے پاس بلا لوں گا۔ اور
آخر اس کی حد سے بڑھی ہوئی تھکاوٹ نے بیٹے کو شہر جانے کی اجازت دے دی۔

دو مہینے تک اس کے امید بھرے خطوط آتے رہے کہ ابھی نوکری نہیں ملی۔ مگر جلد مل جائے گی۔ اور وہ سب کو بلا لے گا۔ پھر اس کا خط آیا لکھا تھا ـــــــــ شہروں میں کام نہیں ہے قصبوں میں کام نہیں ہے۔ وہ جاہل ہے۔ وہ دنیا میں کچھ نہیں کر سکتا۔ وہ صرف سامان ڈھونے والا خچر بن سکتا ہے۔ مگر وہ خچر نہیں بنے گا۔ وہ بھوکا مر جائے گا ـــــــ اور وہ اپنا کلیجہ تھام کر رہ گئی۔ وہ روتی رہی اور سوچتی رہی کہ اس کا بیٹا جاہل کیسے ہے اس نے اسے مڈل تک پڑھایا ہے۔ یہاں کتنے مڈل پاس ملازم ہیں۔ اسکول میں ماسٹر تک مڈل پاس ہیں۔ اور پھر اس نے اپنے بیٹے کو خط لکھوایا کہ وہ آجائے۔ وہ پھر اسی طرح محنت مزدوری کر کے سب کا پیٹ بھرے گی۔ اب اس میں کام کی طاقت آ گئی ہے اور وہ اب بیکار بیٹھے بیٹھے بھی اکتا گئی ہے۔ وہ گھر ضرور آجائے۔ دلہن اداس رہتی ہے۔ اور اس کی گود ہری ہونے والی ہے۔ مگر وہ نہیں آیا۔ بیٹے کے لئے اس کا دل ہر وقت تڑپا کرتا اور بہو اداس پھرا کرتی۔ اس کے میلے کپڑے رہتے اور الجھے الجھے بال افشاں کے لئے ترسا کرتے وہ کچھ چڑچڑی سی ہو گئی تھی۔ کبھی کبھی دونوں میں ہلکی سی جھڑپ بھی ہو جاتی۔ پھر ایک مہینے بعد اس کے بیٹے کا خط آیا۔ اس نے لکھا تھا کہ وہ بڑا خوش قسمت ہے جو سات سمندر پار لڑائی شروع ہو گئی ہے اس نے لڑائی پر جانے کے لئے نام لکھوا لیا ہے۔ ابھی وہ سپاہی بنا ہے۔ پھر اس کے عہدے پر ترقی ہوتی چلی جائے گی۔ وہ بڑا آدمی بن جائے گا۔ اور وہ اپنی ماں کے لئے بڑے زمیندار جی کی حویلی سے اچھی حویلی بنوائے گا۔ یہ خط سن کر اس کا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ وہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر روتی رہی۔ مگر پھر سب کے سمجھانے پر کہ یہ بدشگونی ہے اس نے اپنے سینے پر پتھر رکھ لیا۔ پھر بھی اٹھتے بیٹھتے اس کے دل

سے ہائے نکلتی۔ اس کا بیٹا اس سے بھی مل نہ سکا تھا۔ اور کہیں باہر بھیج دیا گیا تھا وہ ہر وقت اداس اور پریشان رہتی۔ بہو سے دل بہلانے کی کوشش کرتی۔ مگر بہو کو تو جیسے اس سے نفرت ہوتی جارہی تھی۔ اس کے محبت کے جواب میں وہ چڑچڑا اٹھتی اور آخر ایک دن لڑکر وہ اپنے میکے چلی گئی۔ بہو نے اس کے ساتھ رہنے سے یہ بہتر سمجھا تھا کہ وہ گھر میں اکیلی رہے۔ اب مائی کا جی اور بھی اچاٹ ہو گیا تھا۔ تنہا گھر کھانے کو دوڑتا۔ اس پر بیٹے کی یاد، جدائی کا غم، بیٹے کے خط آتے رہتے۔ وہ ہمیشہ لکھتا تھا کہ لڑائی جلدی ختم ہو گی۔ وہ بہت جلد گھر آئے گا۔ اس کے عہدوں میں ترقی ہوتی جائے گی۔ مگر ایک سال، دو سال، تین سال لڑائی ختم نہیں ہوئی۔ اس کا انتظار بڑھتا گیا۔ اس کا دکھ ترقی کرتا گیا۔ اس نے بہو سے صلح کرنی چاہی مگر وہ راضی نہ ہوئی۔ وہ اپنے پوتے سے بھی محروم تھی ——— وہ اسے گود میں لینے کو ترستی۔ بہو اسے طعنے دیتی کہ تجھے بچوں کی کیا ضرورت ہے تجھے روپیہ چاہیئے۔ اور اب اس کی کمی نہیں اور پھر خود بھی جب تنخواہ آتی تو آدھی بٹانے آجاتی۔ اس دن خوب خوب لڑائی ہوتی۔ پھر جب بہو چلی جاتی تو وہ گھنٹوں کلیجہ پھاڑ پھاڑ کر رویا کرتی اور سوچنے لگتی کہ جب اس کا بیٹا آئیگا وہ اس کی دوسری شادی رچائے گی۔ اپنا پوتا بھی ڈائن سے چھین لے گی۔ مگر اس کا بیٹا نہیں آیا۔ اس کی موت کی خبر آئی۔ اور یہاں پہنچ کر اس کی یادوں کی دنیا میں ایک کہرام مچ گیا۔ اور وہ ایک چیخ مار کر رونے لگی۔ اوندھی پڑی ہوئی بہو بھی سیدھی بیٹھ کر سسکیاں بھرنے لگی۔ اس کے پپوٹے پھول گئے تھے اور آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں، گال تمتما رہے تھے۔ اور اس کی بن چوڑیوں کے اجڑی ہوئی کلائیاں جیسے اپنا سہاگ مانگ رہی تھیں۔ کلو کی ماں دیر سے اونگھ رہی تھی چونک کر تسبیحوں کے رٹے ہوئے بول پھر سے دہرانے

لگی تھی اور وہ تھوڑی دیر رو کر چپ ہو گئی اب وہ یہ سوچ رہی تھی کہ جانے اس کے بیٹے کا کفن کیسا ہو گا۔ قبر کی زمین کیسی ہو گی اس کے جنازے میں کتنے کاندھے دینے والے ہوں گے اور جانے سرکار نے کسی مولوی کو قرآن شریف پڑھنے کو بھی بٹھایا ہو گا یا نہیں، پتہ نہیں کیا ہو گا اور کیا نہیں۔ اس کا کون تھا وہاں — سب غیر اور اس خیال سے وہ تڑپ تڑپ اٹھی۔

کلو کی ماں۔ "پتہ نہیں میرے لال کا کفن دفن کیسے ہوا ہو گا۔ بڑے ارمانوں سے پالا تھا۔ میں نے اپنے لال کو" اور وہ بچوں کی طرح بلک بلک کر رونے لگی۔ کلو کی ماں کا چہرہ ایک دم پھیل گیا۔ جیسے وہ کوئی بڑا بھیانک منظر دیکھ رہی ہو، پھر وہ آہستہ آہستہ بتلانے لگی۔

پچھلے دنوں وہ اپنے بیٹے کے ساتھ شہر گئی تھی، اس کے بیٹے نے اسے سینما دکھایا تھا، سب سے پہلے اس نے لڑائی کی تصویریں دیکھی تھیں، پتہ نہیں کہ کیسی کالی کالی مشین تھیں، جو خرگوشوں سے بھی زیادہ دوڑتی تھیں۔ ان سے بڑی ڈراونی آوازیں نکلتی تھیں۔ تو ایک دم دھواں اٹھنے لگتا تھا، ہر طرف آگ ہر طرف دھواں زمین سے تک اڑ اڑ جاتی تھی، پھر بھلا انسانوں کا کیا پتہ چلتا، یوں پچاسوں آدمی ختم ہو جاتے تھے کہ بڈی بوٹی تک کا پتہ نہ چلے، پھر کہاں کا کفن کہاں کی — اور پھر کلو کی اماں نے جیسے خوف سے آنکھیں بند کر لیں۔

اور آہستہ آہستہ بڑبڑانے لگا۔

"بڑی ظالم لڑائی ہے کلو کہتا تھا اگر کچھ دن اور رہی تو ساری دنیا ختم ہو جائے گی ـــــــ اس کے بیٹے کا اتنا حیرت ناک انجام!

وہ اتنی طاقت سے چیخ کر رونے لگی جیسے اتنا روئے گی، اتنا روئے گی۔ کہ ان آنسوؤں میں بہہ جائے گی، ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے گی، بہو نے دونوں ہاتھوں سے سینہ بھینچ لیا تھا، شاید اس میں رونے اور چیخنے کی طاقت نہ رہ گئی تھی۔

وہ بڑی بے بسی سے سسک رہی تھی۔ یہ چیخیں ذرا دیر میں ختم ہو گئیں۔ ماں بے ہوشی کی حالت میں زمین پر پڑی اوبی اوبی سانسیں لے رہی تھی۔

"کلو کی اماں لڑائیاں کیوں ہوتی ہیں؟ بہو نے تڑپ کر پوچھا

"بس ہوتی ہیں" کلو کی ماں کی عقل جیسے حیران تھی۔ اور رات ختم ہو چکی تھی لو پھوٹ رہی تھی۔ دیا بجھ گیا تھا۔ پیالے میں رکھے ہوئے انگاروں پر راکھ کی سفید تہیں جم چکی تھیں۔

بیٹے کی موت کی خبر کے آٹھ دس دن گذر چکے تھے۔ مگر وہ تھی کہ جیسے غموں کے سمندر کی تہ میں جم کر رہ گئی تھی۔ ہر وقت کھوئی کھوئی ڈوبی ڈوبی نہ کسی نے ذرا اس سے ہمدردی کی اور وہ پھوٹ پھوٹ کر روئی اور پھر ایک دم خاموش۔ ایسی خاموش جیسے اب کبھی نہ بولے گی۔

یہ تو دائمی خاموشی ہے ۔ کوئی لاکھ اِدھر اُدھر کی باتیں کرتا رہے ۔ مگر وہ چپ سنّی گھر میں بیٹھی ہے ۔

باہر دھوپ میں چبوترے پر بیٹھے اونگھ رہی ہے ۔ جاڑوں کی سرد اور خشک ہوائیں دھواں اڑاتی پھر رہی ہیں ۔ وہ ہے کہ دھوپ میں تپی جا رہی ہے ۔ مگر کچھ ہوش نہیں ۔ وہ بہو جو اس کی صورت دیکھنا پسند نہ کرتی تھی ۔ اب اس کے صدقے ہوتی پھر رہی ہے وہ ہر وقت اس کے کان میں پھونکتی رہتی کہ اب وہ اس کو اپنا بیٹا سمجھے ۔ وہ عمر بھر خدمت کرے گی ۔ لیکن وہ جیسے کچھ سنتی ہی نہ تھی ۔ اور تو اور اسے اب اپنے گھونگھٹ تک کا خیال نہ رہا تھا ۔ بیٹے کی موت کی خبر سے ایک دن پہلے بھی تو بوڑھی تھی ۔ لیکن جب باہر نکلتی تو اپنے چنے ہوئے ڈوپٹے جیسی ململ کے چہرے کو لمبے گھونگھٹ میں چھپا لیتی تھی ۔ اب تو اسے اس دنیا سے جیسے سروکار ہی نہ رہا تھا ۔ ایک الگ دنیا جہاں کالی کالی مشینیں خرگوشوں کی طرح دوڑتی پھرتی تھیں ۔ دھماکے ہوتے رہتے تھے ۔ اور گہرا سیاہ دھواں اڑتا رہتا تھا اس کا بیٹا بار بار اس دھوئیں میں ابھر ابھر کر غائب ہوتا رہتا تھا ۔ اور بڑھیا کی تمنا بڑھتی جاتی تھی ۔ کہ وہ بھی اسی دھوئیں میں گم ہو جائے ۔ مگر آہستہ آہستہ اسے پوتے کی توتلی بھولی باتوں میں پناہ ملنے لگی ۔ وہ خود کو بہلانے لگی پھر بھی جی اچاٹ اچاٹ رہتا ۔ گھر کے کاموں میں زبردستی ٹانگ اڑاتی اور

ذرا دیر میں بیزار ہو جاتی۔ باہر چبوترے پر جا بیٹھتی۔ آنکھوں سے بہتا ہوا میلا پانی اور وہ اپنی دھندلی آنکھوں سے دور دیکھنے لگتی۔ وہ رہی پکی لال اینٹوں سے بنی ہوئی اسکول کی عمارت، وہ رہا لڑکوں کے کھیلنے کا میدان! وہ الٰہی بخش کے مکان کی کارنس پر کوا بیٹھا بول رہا ہے۔ شاید کوئی مہمان آنے والا ہے۔ اور پھر وہ ہر راہ گیر کو دیکھنے لگتی۔ یہ کون ہے؟ اور یہ جوان لڑکیاں چلچلاتی دوپہر یا میں کہاں پھر پھر کرتی پھر رہی ہیں۔ پھر وہ ان لڑکیوں کے لئے کچھ سوچنا چاہتی مگر جی اچاٹ ہو جاتا۔ بیٹے کی یاد ہوک بن کر کلیجے میں اٹھنے لگتی اور وہ جلدی سے گھر میں آکر مٹی میں کھیلتے ہوئے پوتے کو سینے سے بھینچ لیتی۔ تو ذرا سکون ملنے لگتا ——

یوں دھیرے دھیرے وہ اس دنیا سے لوٹنے لگی۔ جہاں جا کر وہ سارے راستے بھول گئی تھی۔ مگر اب اسے بہو بڑی کھٹکتی۔ وہ اس کی خدمتوں کو نہ سراہ سکتی تھی۔ اس کے دکھوں سے اسے ذرا بھی ہمدردی نہ تھی۔ وہ دیکھتی کہ بہو کس طرح کونوں کھدروں میں منہ چھپا چھپا کر رویا کرتی ہے۔ اس کی راتیں کروٹیں بدل بدل کر گزر جاتی ہیں۔ اس کے کپڑے میلے چیکٹ رہتے ہیں۔ وہ سر میں تیل نہیں ڈالتی۔ وہ کنگھی نہیں کرتی۔ اس کے بال بیا کا جھونجھ ہو رہے ہیں۔ اور اسے دنیا کا ہوش نہیں۔ پھر بھی وہ اس سے نفرت کرتی۔ اسے ہر وقت یہ خطرہ رہتا کہ کب کوئی

یار کر کے نکل کھڑی ہو گی۔ ابھی تو تازہ غم ہے، دنیا کا ڈر ہے اور پھر اس کا جی چاہتا کہ بہو کا یہ بھرا بھرا گول چہرہ بگاڑ دے۔ اس طرح کے کھڑا کھڑا ناک نقشہ بگڑ جائے۔ اور بس کھنڈر ہی کھنڈر رہ جائیں۔ ورنہ ایک بار تو یہ کلموہی اس کے بیٹے کی روح کو بھی شرما دے گی۔ اس کا بھلا زور ہی کیا۔ جب چاہے چھوڑ کر چلتی بنے۔ وہ بہو سے اپنی لیا پونجی بھی چھپا کر رکھتی۔ اس کے بیٹے کی کمائی، اس کی لال جیسی زندگی کی قیمت، تعجب ہی کیا کہ بہو اس پر بھی ہاتھ صاف کر دے۔ اور تو اور اس نے بہو کی جمع جتھا پر بھی قبضہ کر رکھا تھا۔ اس لئے وہ بھی اس کے بیٹے کی کمائی تھی۔ لیکن بہو نے اس سے ایک لفظ نہ کہا تھا۔ اسے جیسے کسی چیز سے مطلب ہی نہ رہا تھا۔ ساس اور بیٹے کی خدمت جیسے اس کی زندگی کا مقصد بن کر رہ گئی تھی۔

ساس کو پلنگ بیٹھے روٹی دیتی۔ رات کو پاؤں دبا دبا کر سلاتی۔ اور جب ساس کو چڑچڑاتے دیکھتی تو گلے میں ہاتھ ڈال کر اس کے سینے سے لگ جاتی۔ مگر اُسے بہو کی یہ سب حرکتیں پرلے درجے کی مکاری معلوم ہوتیں۔ وہ اندر ہی اندر جلنے لگتی اور سوچتی کہ دیکھیں بنو! اب پاؤں نکالتی ہیں۔ مگر دن گزرتے گئے اور بہو کی خدمت بڑھتی گئی تھی۔ یہاں تک کہ وہ دیکھتی کہ اسے اپنے بچے سے زیادہ اس کا خیال رہتا ہے۔ اور آخر اس نے شرمندہ ہو کر بہو کے سامنے سارے ہتھیار ڈال

دیئے۔ وہ بڑے دل کی نہ تھی۔ اس کا دل صاف تھا۔ بہو اسے عزیز ہوتی
گئی۔ اور ایک دن اس نے کوٹھری کے تالے کی چابی اپنے کمر بند سے
کھول کر بہو کو سونپ دی۔ "سب کچھ تمہارا ہے بچی"۔ اور بہو کو سینے
سے لگا کر رونے لگی۔ اس کے بعد اس نے جیسے مطمئن ہو کر گھر کے تمام
معاملات سے قطع تعلق کر لیا۔ بس خدا کی یاد میں دن گزارنے شروع کر
دیئے۔ گود میں پوتا اور ہاتھ میں تسبیح، بہو اسے محبت سے کھلاتی پلاتی
اور پھر پاؤں دبا دبا کر سلا دیتی۔ اتنی خدمت اتنی محبت کہ اسے کبھی کبھی محسوس ہوتا
کہ اس کا لال زندہ ہے۔ وہ نہیں مرا۔ اس کی زندگی کے بقیہ دن آرام سے
گزر جائیں گے۔ اور اس تصور ہی سے اس کی آنکھوں میں آنسو آجاتے
وہ اپنی کوٹھری میں پڑے پڑے بہو کو پکارنے لگتی اور
جب وہ دوڑتی ہوئی آتی تو وہ خواہ مخواہ کہہ دیتی کہ پیاس لگی ہے

یوں بھی کچھ دن گزر گئے۔ اسے سرکار کی طرف سے ملنے والی پنشن
کی سخت فکر تھی۔ کہ کہیں اس میں کوئی گڑبڑ نہ ہو جائے۔ وہ چاہتی تھی کہ
کس طرح پنشن کی بات ہو تو وہ بہو کے نام کرا دے۔ اور پھر بس ہر طرف سے
اطمینان ہو جائے۔ وہ بار بار ان لوگوں سے پوچھتی رہتی کہ جن کے
شوہر، بیٹے اور بھائی جنگ کی نذر ہو گئے تھے۔ لوگ اسے اطمینان
دلا دیتے کہ اب کی ایک آدھ کا معاملہ نہیں۔ قصبے کے کئی جوان تابڑ توڑ
شہید ہو رہے ہیں۔ جب سب کے وارثوں کو پنشن ملے گی۔ تو اسے بھی مل جائے

گی۔ اور جب حکومت کی طرف سے مرنے والوں کے جائز وارثوں کی چھان بین کی گئی تو بڑھیا سب سے آگے تھی۔ اس نے اپنے بجائے اپنی بہو کا نام لکھا دیا۔ اور جب وہ آہیں بھرتی گھر آگئی اور بہو کو بتایا کہ وہ پنشن اس کے نام کرا آئی ہے۔ تو وہ چند لمحوں کے لئے حیران سی کھڑی رہ گئی۔ ایک عرصہ کے بعد اس کا چہرہ خوشی سے سرخ پڑا۔ اور اس کی آنکھوں میں جیسے بہت سے سہانے خواب ناچنے لگے۔ اس نے دھول میں کھیلتے ہوئے بچے کو زمین سے اٹھا کر لپٹا لیا ——— "میرا راجہ، میرا بیٹا ———" وہ بچے کو زور زور سے بھینچنے لگی ——— میرا بیٹا پڑھے گا۔ یہاں سے کرشہر تک میرا بیٹا تھانیدار بنے گا۔ ڈپٹی بنے گا، کلکٹر بنے گا۔ میرا لال سب کچھ بنے گا۔ میرا بیٹا غریب نہیں رہے گا۔ اب کیا دکھ، میرا بیٹا کبھی بھی غریب نہیں ہو گا۔ وہ کبھی بھی بھوکا نہیں رہے گا۔ وہ کبھی بھی سات سمندر پار ہونے والی لڑائیوں پر نہیں جائے گا۔ اور وہ اتنے زور زور سے بچے کو دبوچنے لگی کہ وہ رونے لگا۔ وہ بہو کو حیرت سے دیکھتی رہی کہ اس وقت وہ اس کے گلے میں ہاتھ ڈالنا بھول ہی گئی تھی۔ مگر اسے برا نہ لگا۔ وہ اسی کی وجہ سے تو ایک بار پھر زندہ ہو گئی تھی۔ لیکن جب اس نے دیکھا کہ بہو نے نہ جانے کن خیالوں میں سارا دن گزار دیا۔ اور اسے وقت پر کھانا بھی نہ دیا تو اسے برا سا لگا اس نے بہو سے بڑے ناز سے شکایت کی تو وہ چڑچڑا اٹھی ———

آج ذرا دیر ہو گئی تو کیا آفت آ گئی" اور وہ بہو کے جواب پر دم بخود رہ گئی۔

اب بہو کا سارا وقت اپنے بیٹے کی دیکھ بھال میں صرف ہوتا۔ یہ کھلا، وہ پلا، ابھی بہلایا جا رہا ہے۔ ابھی اس کے کپڑے لئے جا رہے ہیں۔ اور پھر الف بے کا قاعدہ اسے پڑھا رہی ہے۔ کوئی کام کہا جاتا تو چڑچڑا اٹھتی۔ نہ کوئی کھانا دینے والا تھا نہ پاؤں دبانے والا۔ اور تو اور اس کے پوتے کو بھی اس سے زیادہ الگ رکھا جاتا۔ اور یہ بات اس کے لئے کتنی ناقابل برداشت تھی۔ آخر ایک دن وہ بہو سے لڑ پڑی۔ کہ وہ اس کے لال کی نشانی کو تو اس سے نہ چھڑائے۔ مگر بہو بھی جیسے بھری بیٹھی تھی۔ چیخ چیخ کر سارے محلے کو جمع کر لیا۔ رو رو کر شکایتیں کرنے لگی۔ کہ بڑھیا ڈائن اس کے بچے کو پھلتا پھولتا نہیں دیکھ سکتی۔ اس سے اس کا شوہر شادی کے چند دنوں کے بعد ہی چھین لیا، اپنے عیش کے لئے، اور اب اس کے بچے کو بھی چھین لینا چاہتی ہے ———— بہو کی باتوں پر وہ چپ چاپ کھڑی کانپتی رہی۔ اور اپنی کوٹھڑی میں جا کر اندر سے دروازہ بند کر لیا۔ وہی کوٹھڑی جہاں اس نے آرام سے زندگی گزار دینے کا حسین تصوّر کیا تھا۔ وہیں زندگی کے اتنے بھیانک ہو جانے پر سسک سسک کر روتی رہی۔ پچھتاتی رہی۔ کہ اس نے اپنے ہاتھ سے سب کچھ دے دیا۔ اور شام کے جھٹپٹے میں جب وہ خوب رو چکنے کے بعد کوٹھڑی سے نکلی تو

بہو اپنے بچے کے ساتھ اپنے گھر جا چکی تھی۔ اور اس گھر میں جھاڑو پھر گئی تھی۔ گر مٹی کے چند برتنوں اور مٹی میں ملنے والی بڑھیا کے علاوہ کچھ بھی نہ رہا تھا۔ وہ پاگلوں کی طرح سر پیٹتی اور روتی رہی۔ محلے کی عورتیں اسے سمجھاتی رہیں۔ اس کے علاوہ کوئی کر بھی کیا سکتا تھا۔

رو دھو چکنے کے بعد اب صرف ایک سوال بھوت کی طرح اس کے سامنے کھڑا تھا۔ وہ اب اپنا پیٹ کیسے بھرے گی۔ اب اس سے محنت مزدوری ہو نہ سکتی تھی۔ اس کی کمر ٹوٹ چکی تھی۔ محلے والوں نے دو چار دن ترس کھا کر اسے دو وقت کھانا کھلا دیا تھا۔ مگر کوئی یوں کب تک کھلاتا جنگ سات سمندر پار کر ہو رہی تھی۔ اور مہنگائی کا بھوت یہاں ناچ رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کرے۔ گھر میں پڑی چپ چاپ رویا کرتی اور جب کئی کئی وقت خالی پیٹ گزر جاتے تو پھر بلبلا کر گھر سے نکل پڑتی۔ اِدھر اُدھر گھروں میں جا بیٹھتی، کبھی بے مانگے اور کبھی مانگنے کے بعد آدھی روٹی سے زیادہ نہ ملتی۔ جس سے پیٹ کی آگ تو تھوڑی بہت بجھ جاتی۔ مگر دل کی آگ زیادہ ہو جاتی جسے آنسوؤں سے بجھانے کی کوشش کرتی۔ پھر کچھ دن گزرے تو صرف پیٹ ہی آگ رہ گئی۔ دو ایک گھر میں گھنٹوں اسی انتظار میں بیٹھی رہتی کہ شاید کچھ مل جائے۔ لیکن زیادہ تر ٹکا سا جواب ملتا

اس دن شام کو بھی وہ اسی فکر میں بڑے زمیندار کی حویلی کے صدقے ہو رہی تھی۔ مگر زمیندار کی بیوی بھینسوں کے لئے سانی تیار کرا رہی تھی۔ زمیندار کی بہن اپنے بچے کو دودھ

پلانے میں گم تھی۔ اور زمیندار کی بیٹی اپنے چھوٹے بھائی بہنوں کا پیٹ دودھ مکھن اور روٹی سے پاٹ رہی تھی۔ اور ساتھ ہی ساتھ ان کے کم کھانے اور زیادہ گرانے پر چڑچڑا بھی رہی تھی۔ اور وہ کئی وقت کی بھوکی زمین پر گرتے ہوئے دودھ اور روٹی کے بڑے بڑے ٹکڑوں کو تاک رہی تھی۔ انتظار کرتے کرتے کافی اندھیرا ہو گیا تھا اور وہ اُٹھنے ہی والی تھی۔ کہ زمیندار کی لڑکی نے اسے بٹھا لیا۔ پھر بڑی سی پلیٹ میں وہی سالن اور روٹی لئے اس کے پاس پہنچ گئی۔ لو کھاؤ مائی اور ضرورت ہو تو مانگ لینا، بھوکی نہ رہنا، تمہیں میری قسم ہے تکلف نہ کرنا۔ اس نے پلیٹ سامنے رکھ دی ـــ میں پانی بھی لے آؤں"۔ اور وہ دوڑ کر پانی بھی لے آئی اور پھر اس کے قریب ہی پیڑھی پر بیٹھ کر سرگوشی کے انداز میں کہنے لگی ـــ مائی جب بھوک لگا کرے تو یہاں آجایا کرو۔ مجھے سب کچھ معلوم ہے کہ تمہاری بہو کیسی خراب کرتی ہوگی۔ فکر کی کوئی بات نہیں، کوئی ضرورت ہو، مجھ پاس آؤ" اور وہ دم بخود کھانا کھاتی رہی۔ وہ اسے دعائیں دینا بھی بھول گئی تھی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ ایسے بُرے وقت میں کوئی ایسی مہربانی سے بھی پیش آسکتا ہے۔ جب وہ پلیٹ صاف کر چکی تو لڑکی دوڑی دوڑی گئی اور ڈبل روٹی میں مکھن کی بڑی سی گولی لپیٹے واپس آگئی۔

اس سے صبح ناشتہ کر لینا ـــ اس نے مائی کے پلّو میں روٹی باندھ دی۔" پر دیکھو مائی جو ضرورت ہو۔ اگر مجھی سے کہا کرنا۔ یہ سب گھر والے تو بڑے وہ ہیں ہاں!

ـــ لڑکی نے بالکل چپکے سے کہا، اور پھر اپنے ارد گرد دیکھ کر کھسر پھسر کرنے لگی

ـــ مائی میرا ایک کام کرو گی ؟

"ہاں! بیٹی! ایک کام کیا اس وقت تو وہ ہزار کام کر سکتی تھی۔

"میرا یہ خط پہنچا دو۔ وہ ہے نا نورالدین کا لڑکا وہی بڑے اسکول میں پڑھتا ہے گورا سا گھنگھریالے بال، اسی کو دے دینا۔ اور بار بار کہنا کہ آج رات میرے گھر کے پچھواڑے ملنے آ سکے"

اب؟؟؟ اور اس کا جی چاہا کہ جو کھایا ہے قے کر کے نکال دے

"اور دیکھو مائی جو کل سے تم دونوں وقت کھانا کھانے نہ آئیں تو اپنی قسم میں بھی نہ کھاؤں گی۔ اگر تم بھوکی رہو تو مجھے کھاؤ۔ اس نے بڑے پیار سے کہا اور کاغذ کا پرزہ اس کی مٹھی میں ٹھونس دیا۔ مگر دیکھو مائی گھر میں اور کسی سے کھانے کو نہ مانگنا۔ انہیں غریبوں سے نفرت ہے۔ مجھے غریبوں سے بڑی محبت ہوتی ہے۔ وہ بے چارا غریب ہے" اور پھر وہ خود بخود شرما گئی۔ منہ چھپانے لگی۔ اور اسے اسی حالت میں چھوڑ کر چلی آئی اور جب خط لے جا کر جا رہی تھی تو مارے غصے کے لڑکی کو گالیاں دیتی جا رہی تھی۔ بار بار جی چاہ رہا تھا کہ خط پھاڑ کر پھینک دے۔ مگر اسے اپنی بھوک یاد آ جاتی۔ اور وہ رو پڑتی۔

دن گزرتے گئے، دن گزرنے ہی کے لئے تو آتے ہیں۔ لیکن کیا کچھ لے جاتے ہیں، کیا کچھ چھوڑ جاتے ہیں۔ مائی کے پاس بھی کچھ چھوڑ گئے تھے۔ دلالی، زمیندار کی لڑکی کی شادی دوسرے زمیندار سے ہو گئی تھی۔ غریب لڑکے نے زہر کھا لیا تھا۔ مگر مائی کو اس سے کیا مطلب تھا۔ وہ دو ایک سال میں ایسی ماہر ہو گئی تھی۔ اپنے پیشے میں کہ ذرا دیر میں لڑکوں اور لڑکیوں کی قسمت کا فیصلہ کر دیا کرتی، لڑکیاں زیادہ تھیں، لڑکے کم تھے۔ لڑکوں کو

______ بھوک نے شہروں کی طرف ہنکا دیا تھا۔ کچھ کو جنگ نے کھا لیا تھا۔ ایک ایک لڑکے کی چار چار محبوبائیں تھیں اور ان چاروں

میں سے ہر ایک یہی سمجھتی کہ اس کا محبوب صرف اس کا محبوب ہے
یہ سب مائی کے کرشمے تھے اور پھر رات کی تاریکیوں میں کیا کچھ بنا یا
دیا جاتا۔ کیا کچھ نہ گنوا دیا جاتا اور جب وہ رات کی تاریکیاں لڑکیوں
کے کولہوں میں چھپی نظر آتیں تو وہ کھٹ سے اپنی بار غار والے
کا انتظام کر دیتی کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوتی۔ کتنی زندگیاں وجود میں
آنے سے پہلے ختم کر دی جاتیں، مگر اب مائی کا پیٹ بھرنے لگا تھا۔
اس کے ہاتھ میں دو چار پیسے بھی تھے۔ اب اسے اس کے علاوہ کوئی
دکھ نہ تھے۔ اس کے لال کی نشانی اس کی اپنی نہ تھی۔ وہ اسے
دیکھنے تک کو ترستی رہتی، پس جب اس کا پوتا اپنی ماں کے ساتھ
انگلی پکڑے اسکول جاتا اور واپس آتا تو وہ دور سے کھڑے ہو کر
اسے دیکھا کرتی۔ لیکن اس وقت وہ اسے اپنی آغوش میں لینے
کے لئے تڑپ اٹھتی۔ اسے پیسے دینے اور اپنے ہاتھ سے مٹھائی
کھلانے کے ارمان میں مر مر جاتی۔ مگر بہو سائے کی طرح اس کے رہتی
تھی اور وہ نہ جانے کس امید پر دو چار پیسے جمع کرتی رہتی۔"

مویشی خانے کے پرانے منشی کا تبادلہ ہو گیا اور اس کی جگہ بالکل
چھوکرا منشی آ گیا تھا۔ مائی اس کا حال چال معلوم کرنے فوراً اس کے
گھر پہنچ گئی۔ ذرا دیر جو کریدا تو معلوم ہو گیا کہ بڑا رنگیلا ہے دوسرے
دن گئی تو خود ہی فرمائش کر بیٹھا۔

کچھ دلاؤ نا مائی ۔"

"جو مانگو ——— مگر ——— اور وہ جیسے ہی چپ ہوئی منشی نے ایک روپیہ جیب سے نکال کر اس کی ہتھیلی پر رکھ دیا۔

"سمجھ یہ قریب کی لڑکی بہت اچھی ہے مائی "

"کون بٹیا ؟"

"وہ اس گھر والی ۔" منشی نے اس کی بہو کے گھر کی طرف اشارہ کر دیا ۔ اور مائی کا سارا جسم جیسے جھنجھنا سا ہو کر رہ گیا ۔ کبھی وہ اسے اپنے بیٹے کے لئے بیاہ کر لائی تھی ۔ ہائے اس کا لال ۔ اور اس کی آنکھوں میں آنسو آتے آتے رہ گئے ۔ اس کا جی چاہا کہ روپیہ منشی کے منہ پر کھینچ مارے ۔ اور پھر اتنی گالیاں دے کہ حلیہ بگاڑ دے

سنا ہے مائی کہ شوہر مر گیا ہے ۔ ایک ننھا سا بچہ ہے ۔ بڑی دکھی ہے راتوں کو رویا کرتی ہے ۔ اکیلی رہتی ہے ۔ ایک بار تو ایسا سکھ دوں کہ بھول جائے سب کچھ "۔

" ہوں !" مائی خاموشی سے اٹھ کھڑی ہوئی

آج شام تیار رہنا ۔ میں اسے خوب جانتی ہوں ۔ تمہیں لے چلوں گی ۔"

"سچ مائی ؟" منشی کا منہ ایک دم انگارہ ہو گیا اس کی بوٹی بوٹی پھڑکنے لگی ۔ اور مائی جانے کے لئے اٹھی تو منشی نے ایک اور روپیہ اس کی طرف بڑھا دیا ۔ مگر مائی نے دونوں روپے واپس کر دئے ۔

گھر آ کر سارا دن وہ گم سم بیٹھی رہی ۔ نہ کچھ کھایا نہ پیا ۔ کہیں آئی گئی ۔ لیکن جیسے ہی سرمئی شام میں رات کی تاریکی گھلنے لگی ۔ وہ

اپنی لٹھیا ٹیکتی منشی کے گھر پہنچ گئی۔ منشی ایسا بنا سنورا بیٹھا تھا۔ کہ بس سہرے کی کسر معلوم ہوتی تھی۔ مائی نے اسے اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا اور جب بہو کے مکان پر پہنچی تو ابھی دروازے بند نہیں ہوئے تھے۔

"اندر چلے جاؤ" مائی نے سرگوشی کی۔ منشی ذرا جھجکا تو مائی نے ہمت بندھائی۔ "چلے جاؤ نا۔ وہ تو تمہارے انتظار میں بیٹھی ہوگی" ——— منشی اندر گیا تو اس نے دروازہ باہر سے بند کر کے زنجیر چڑھا دی۔ پھر زور زور سے چیخنے لگی۔

ہائے رنڈی۔ ہائے بدمعاش۔ ہائے میرے بیٹے کو کھا گئی اور اب چپکے چپکے مزے لوٹ رہی ہے۔ ہائے میں لٹ گئی ۔ محلے کے تمام لوگ جمع ہو گئے تھے۔ مائی زمین پر لوٹ لوٹ کے چیخ رہی تھی۔ منشی ایک لمحے تک چوروں کی طرح کھڑے رہنے کے بعد بھاگ گیا۔ بہو ننگے سر ننگے پاؤں سب کے سامنے کھڑی تھی۔ بزرگ اسے شرم دلا رہے تھے جوان لڑکے آنکھیں مار مار کر ہنس رہے تھے۔ اور بہو پاگلوں کی طرح چیخ رہی تھی۔

"میں نے کچھ نہیں کیا، میں کچھ نہیں جانتی"

"مجھے میرا پوتا دلا دو، یہ اسے بھی بدمعاش بنا دے گی۔ ہائے میرے لال کی نشانی کو برباد کر دے گی" ——— مائی رو رو کر لوگوں سے فریاد کر رہی تھی اور بزرگوں نے مائی کے حق میں فیصلہ کر دیا۔ کہ پوتا اسے ملنا چاہیئے۔

میرا لال مجھ سے کون لے سکتا ہے ——— ؟ میں نے اپنی جوانی اس کے پیچھے برباد کر دی ہے، یہ میری محبت کی نشانی ہے"

"صبح آرام سے فیصلہ ہو گا جی!" لوگوں نے مائی کو تسلی دے کر اس وقت معاملہ ختم کرا دیا۔

لیکن صبح سب کو معلوم ہوا کہ بہو اپنا سب کچھ چھوڑ کر اور صرف اپنے بچے کو لے کر راتوں رات منشی کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔ اور مائی دیوانوں کی طرح اپنے پوتے کے کاٹھ کے گھوڑے سے لپٹ کر روئے چلی جا رہی ہے۔

قائدِ اعظم کا پیغام

اب ہم سب پاکستانی ہیں ـــ نہ بلوچی، نہ پٹھان، نہ سندھی، نہ بنگالی، نہ پنجابی۔ ہمیں پاکستانی اور صرف پاکستانی کہلوانے پر فخر ہونا چاہیے۔ ہم جو کچھ محسوس، جو کچھ عمل کریں، جو قدم بھی اُٹھائیں، پاکستانی اور فقط پاکستانی کی حیثیت میں۔ میں آپ سے کہتا ہوں کہ جب بھی آپ کوئی نیا اقدام کریں تو پہلے رُک کر ذرا سوچ لیجیے کہ یہ آپ کی ذاتی یا مقامی پسند و ناپسند کے زیرِ اثر ہے یا پاکستان کی فلاح و بہبود کا خیال دُوسری سب باتوں پر غالب ہے اگر ہر شخص یوں اپنا محاسبہ کرے گا اور خُود کو مجبُور کر کے اپنے آپ پر اور دُوسروں پر بھی ایمانداری کا اصُول لاگو کرنے کا عادی ہو جائے گا تو میں دیکھ رہا ہُوں کہ پاکستان کا مستقبل انتہائی روشن اور شاندار ہے۔ اگر سرکاری ملازمین اور عوام سب لوگ اس جذبے سے اپنا اپنا کام سرانجام دیں گے، تو اُن کے جذبے اور محنت کا نقش، گہرا نقش اُن کی حکومت اُن کی قوم اور اُن کی مملکت پر بہت جلد پڑ جائے گا اور پاکستان عنقریب ایک عظیم مملکت کی حیثیت میں فتح مندانہ اُبھر کر دُنیا کی عظیم ترین اقوام کی صف میں شامل ہو کر آگے بڑھے گا۔

(کوئٹہ میونسپلٹی کی استقبالیہ میں ـــ ۱۵ جون ۴۸ء)

(صدر: چودھری محمد اکرم، پاکستان مسلم لیگ - مین آفس قومی حلقہ ۸۵ - ۱ - ایل - غزالی روڈ سمن آباد لاہور)